اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

نومبر ۲۰۲۲ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

نیا ایڈیشن چھپ کر آ گیا ہے

اسلام اور تزکیۂ نفس

مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

صفحات ۹۲۸

اسلام میں تعمیر شخصیت کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی دوسری پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ

مکتبہ البرہان لاہور

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

نمبر شمار	کتاب	صفحات	نمبر شمار	کتاب	صفحات
	عصری تعلیم کی اصلاح (اسلامی تناظر میں)		۲۱	اپنی اصلاح آپ کیسے؟	۵۲
۱	ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰	۲۲	ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۹۲
۲	اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰	۲۳	اسلام اور تعمیر سیرت (زیر طبع)	
۳	تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۱۶۷		اسلام اور مغربی فکر و تہذیب	
۴	یکساں قومی نصاب۔ خدشات و مضمرات	۲۰۸	۲۴	اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۶
۵	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے معلمین	۱۶۰	۲۵	اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۶
۶	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے طلبہ و طالبات	۴۸	۲۶	اسلام اور ردِّ مغرب	۲۱۶
۷	پنج سورہ مع پارہ عم (اُردو تفہیم)	۷۶		تفہیمِ دین	
۸	ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت	۱۲۰	۲۷	مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل	۴۰۰
	طلبہ کی اسلامی تربیت		۲۸	شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت	۴۸
۹	تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۷۲	۲۹	رزمِ حق و باطل	۸۰
۱۰	تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ ہینڈ بک و گائیڈ	۱۶۰	۳۰	اسلام اور پاکستان	۳۰۰
	اصلاحِ دینی مدارس		۳۱	عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون	۲۵۰
۱۱	ہمارا دینی نظام تعلیم	۲۵۰	۳۲	مقالاتِ امین (جلد اوّل)	۶۷۶
۱۲	نصابِ مدنی	۴۰	۳۳	مقالاتِ امین (جلد دوم)	۶۴۲
۱۳	مدرسہ ڈسکورسز۔ مطالعہ و تجزیہ	۱۵۶		باللغة العربية	
۱۴	اصلاحِ دینی مدارس	۳۵۲	۳۴	السلطة التشريعية _ دراسة مقارنة	۱۵۰
	اسلامی تحریکیں			English Books	
۱۵	پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟	۲۴۰	۳۵	Islamization of Laws in Pakistan	250
۱۶	خاموش انقلاب ناگزیر ہے	۲۸۸	۳۶	Riyaz us Saliheen I & II	950
۱۷	عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور	۸۴	۳۷	Literal Translation of the Holy Quran Para 1-10	500
۱۸	نئی اصلاحی تحریک کی ضرورت	۷۲			
	تزکیۂ نفس				
۱۹	اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳			
۲۰	حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۶۲			

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔

فون 0309-4607124

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جلد ۲۶، شمارہ ۱۱، نومبر ۲۰۲۲ء / ربیع الثانی ۱۴۴۴ھ

مشمولات

○ فکرونظر

جھوٹی محبت ۴

○ مقالۂ خصوصی

پاکستان کا سیاسی اور دینی بحران اور اس کا حل — ڈاکٹر محمد امین ۵

○ تعلیم و تربیت

- جدید تعلیم: چند اخلاقی اور فکری مباحث — محمد دین جوہر ۱۱
- طلبہ کی تربیت کیسے کی جائے؟ — پروفیسر ملک محمد حسینؒ ۱۹
- محمد حسن عسکری کی ''جدیدیت'' بطور درسی کتاب برائے مدارس دینیہ — حسیب احمد حسیب ۲۲
- پاکستانی جامعات کی حالت زار — آغا ندیم سحر ۲۷
- تدریس القرآن پراجیکٹ کی تقریب — سید عمران طحاوی ۳۰

○ فقہ و قانون

- ٹرانس جینڈر قانون کا اردو ترجمہ — ڈاکٹر محمد امین شعیب مدنی/ سیف اللہ خالد ۳۱
- پاکستان میں نئے باطل نظریۂ جنس LGBT کے 23 واقعات اور ثبوت — شعیب مدنی ۴۱
- جینڈر ڈسکورس — مکرم محمود ۵۱
- ٹرانس جینڈر رایکٹ اور اسلامی قوتوں کا ردّعمل ایک فکری جائزہ — سید خالد جامعی ۵۴

○ فہم دین

جمہور اہل سنت سے جڑے رہنے میں عافیت ہے — ابوالحسن علی ندویؒ ۵۸

○ اسلام اور مغرب

- غامدی صاحب اور سیکولرازم کی حمایت — احمد جاوید ۶۰
- سیڈا: مسلم خاندان کی تباہی کا منصوبہ — ڈاکٹر رضوان اسد ۶۱

○ کہتا ہوں سچ

پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں — باغی ۶۲

English Section

Defending the Islamic Emirate of Afghanistan: Economic and Political Dimensions ۶۴

مدیر

ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

حافظ عمران رضا طحاوی

لیگل ایڈوائزر

محمد یحییٰ رشید، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن

(0309-4607124)

[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 85 روپے

سالانہ 1000 روپے۔ پانچ سال: 5000 روپے

تاحیات 40,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ

سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور

PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

برائے آن لائن مطالعہ

www.alburhaan.pk

کمپوزنگ: حافظ محمد حسین یوسف

0306-4640366

فکرونظر/ربیع الاوّل کا پیغام

جھوٹی محبت

ہم میں سے کون ہے جس نے دنیا میں محبت کا مزہ نہ چکھا ہو!

ہم جب کسی سے محبت کرتے ہیں تو ہم ویسا بننا چاہتے ہیں جیسا ہمارا محبوب ہمیں دیکھنا چاہتا ہے۔ہم ویسا لباس پہنتے ہیں جو اسے اچھا لگے۔ہم ویسا بننا چاہتے ہیں جو اسے پسند ہو۔

ہم محبوب کی ملاقات کے تمنائی رہتے ہیں، اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے میلوں کا سفر کرتے ہیں۔گھنٹوں انتظار کرتے ہیں اور اس انتظار میں اور اس مشقت میں ہمیں بڑا مزہ آتا ہے۔ہم یہ بار بار کرنا چاہتے ہیں اور محبوب کے گھر کے چکر لگانا چاہتے ہیں۔

ہم کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو ہمارے محبوب کو پسند نہ ہو یا جس سے وہ ناراض ہو جائے۔ اس کا خفا اور ناراض ہونا ہم برداشت کر ہی نہیں سکتے۔

لیکن یارو! ہم محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ کیسی محبت کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا محبت کی علامتوں میں سے کوئی علامت ہم میں نہیں پائی جاتی۔محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہتے ہیں کہ یہ کرو، ہم نہیں کرتے۔وہ کہتے ہیں یہ نہ کرو۔ہم وہ کرتے ہیں۔تو یہ کیسی محبت ہے؟

کیا محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ہمارا محبت کا دعویٰ جھوٹا تو نہیں؟

مقالۂ خصوصی

ڈاکٹر محمد امین

پاکستان کا سیاسی اور دینی بحران
اور اس کا حل

ہم سب اس بات کو جانتے اور مانتے ہیں کہ پاکستان اس وقت ایک سیاسی بحران سے گزر رہا ہے جس نے سیاسی اور معاشی عدم استحکام کو جنم دیا ہے اور پاکستانی عوام کی زندگی اس کی وجہ سے اضطراب اور تشویش کا شکار ہے۔ لیکن ہم میں سے بہت سوں کو اس کا احساس نہیں کہ پاکستان اس وقت دینی بحران کا بھی شکار ہے کیونکہ پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں ناکام ہو چکی ہیں۔ وہ سیاسی میدان میں عملاً سرے سے کوئی متبادل ہیں ہی نہیں کہ کوئی سوچے کہ مسلم لیگ، پیپلز پارٹی اور تحریک انصاف کی بجائے اِس یا اُس دینی جماعت کو ووٹ دیا جائے تو وہ حکومت بنا کر ملک کے مسائل حل کر سکتی ہے۔ اسی طرح دینی اصلاحی قوتیں (تبلیغی اور دعوتی جماعتیں، دینی مدارس، مساجد اور تصوف کے حلقے) بھی بڑی حد تک غیر مؤثر اور ناکام ہو چکے ہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ معاشرہ اخلاقی بحران کا شکار ہے، لوگ دین سے دور ہو رہے ہیں اور معاشرے پر عملاً مادہ پرستی اور مغرب کی الحادی تہذیب کے اصول و اقدار غالب آ چکی ہیں۔ جس طرح کوئی صاحب عقل پاکستان کے موجودہ سیاسی بحران کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا، اسی طرح کوئی سوچنے سمجھنے والا انسان اس دینی اور اخلاقی بحران کے وجود سے بھی انکار نہیں کر سکتا جس کی نشان دہی ہم نے سطور بالا میں کی ہے۔ آیئے ان دونوں طرح کے بحرانوں کے اسباب اور ان کے حل پر غور کریں۔

پاکستان کا سیاسی بحران اور اس کے اسباب

* اگر ہم پاکستان کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہماری سیاسی قیادت نے نظری لحاظ سے دو ایسے غلط فیصلے کیے جس کے دور رس قبیح اثرات نکلے۔ ایک یہ کہ پاکستان بننے کے بعد سیاسی قیادت کا یہ رویہ کہ تحریک پاکستان میں دو قومی نظریہ اور پاکستان کو ایک جدید اسلامی ریاست بنانے کا بیانیہ گویا محض ایک وقتی سیاسی نعرہ تھا اور قیادت نے عملاً پاکستانی معاشرے اور ریاست کو اسلام کے مطابق چلانے کے لیے کوئی سنجیدگی نہیں دکھائی۔ اور دوسرے یہ کہ مغربی جمہوریت تو پہلے سے چلی

آ ہی رہی تھی۔ سیاسی قیادت نے عالمی امور میں مغرب کے پلڑے میں اپنا وزن ڈال کر اور بالواسطہ طور پر مغرب کی الحادی فکر وتہذیب (سیکولرزم،لبرل ازم،کیپٹل ازم....) کوقبول کر کے گویا مغرب کی فکری غلامی پر مہر تصدیق ثبت کر دی اور یہ طے ہو گیا کہ پاکستان میں شریعت نافذ نہ ہوگی اور علماء اور دینی قوتوں کو حریف سمجھا جائے گا اور انہیں دبا کر رکھا جائے گا۔ یہ نہ صرف اس عہد سے غداری تھی جو ملت اسلامیہ ہند نے اللہ سے کیا تھا بلکہ اس نے پاکستان میں حکومتوں اور دینی عناصر واسلام پسند عوام کے درمیان ہمیشہ کے لیے بُعد اور کشمکش کی نہ ختم ہونے والی صورت حال پیدا کر دی ہے۔

* ان دو غلط نظریاتی فیصلوں کے دو تباہ کن نتائج نکلے۔ایک سیکولر سیاسی قائدین کا یہ رجحان کہ انہیں ہر قیمت پر اقتدار چاہیے اور دولت چاہیے خواہ یہ ملک کے مفاد کے خلاف ہی کیوں نہ ہو؟ دوسرے فوج نے یہ سمجھا کہ اگر قانون 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کا ہے تو وہ اقتدار کی زیادہ حق دار ہے۔ان دو رجحانات نے ، مذکورہ بالا نظری فیصلوں سے مل کر ملک کو دولخت کر دیا اور جو باقی بچا ہے وہ بھی ڈانواں ڈول ہے۔

* اس پس منظر میں ملک کے موجودہ سیاسی بحران کے اسباب وعلل کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ فوج ''بادشاہ گر'' کے کردار سے ہٹنے کو تیار نہیں۔وہ مغرب کی بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ کے سامنے بھی بے بس ہے لہٰذا اس نے کرپٹ سیکولر سیاستدانوں کے ایک گروہ کو اقتدار دے رکھا ہے اور دوسری طرف ایک اور سیکولر سیاسی جماعت ہے جسے اقتدار سے نکالا گیا ہے وہ اپنی شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ چنانچہ سیاسی کشمکش زوروں پر ہے۔

دینی سیاسی جماعتیں ناکام ہو چکی ہیں اور وہ کوئی متبادل ہی نہیں۔ ان حالات میں ملکی معیشت کا بیڑا غرق ہو چکا ہے اور امریکہ اپنے دانت تیز کر رہا ہے،لیکن جب سیاست کا ہر فریق اپنے مفادات اور انا کا اسیر ہے تو کہاں کا اسلام؟ کہاں کا پاکستان؟ اور کسے پروا ہے پاکستان کے سیاسی اور معاشی بحران کی!

حل کیا ہے؟

ظاہر ہے باہر سے آ کر کوئی ہماری اصلاح نہیں کر سکتا اور نہ ہمارے باہم دست وگریباں

سیاسی اور فوجی عناصر کے درمیان صلح کرواسکتا ہے۔ ہمیں جو کرنا ہے خود ہی کرنا ہے۔ ہم عمران خان کے غیر مشروط حمایتی نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ڈیلیور کرنے میں ناکام ہوا۔ دینی اور نظریاتی طور پر نہ وہ خود یکسو ہے اور نہ اس کی ٹیم۔ نہ وہ ملک میں نفاذ اسلام کا قائل ہے اور نہ مغرب کے چُنگل سے نکلنے اور اس کی الحادی فکر و تہذیب کو رد کرنے پہ مائل ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ دوسرے کرپٹ سیاستدانوں کی بہ نسبت کچھ بہتر ہے۔ لہٰذا ہماری طرح کے بہت سے لوگ سیاسی لحاظ سے پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کے مقابلے میں اس کی حمایت کرتے ہیں۔ اس لیے بھی کہ کوئی دینی سیاسی جماعت ممکنہ متبادل کے طور پر موجود ہی نہیں تو یہ ایک مجبوری ہے۔

دینی سیاسی جماعتوں کے بارے میں یعنی پاکستان کے دینی مستقبل کے حوالے سے ہم سوچنے والوں کی کچھ، خواہشات اور تمنائیں ہیں جو آج تک پوری نہیں ہوئیں اور نہ مستقبل میں پوری ہوتی نظر آتی ہیں مثلاً یہ کہ دینی سیاسی جماعتیں نفاذ اسلام کے لیے متحد ہو جائیں اور دینی اصلاحی و دعوتی جماعتیں اور ادارے ان کی حمایت کریں وغیرہ۔ لیکن اس وقت بات زمینی حقائق کی ہو رہی ہے، خواہشوں اور تمناؤں کی نہیں اور زمینی حقیقت یہ ہے کہ تحریک انصاف اور پی ڈی ایم کے مقابلے میں تیسری کوئی دینی جماعت بطور متبادل ہے ہی نہیں۔ کچھ دینی عناصر پی ڈی ایم میں ہیں، جماعت اسلامی اپنا ووٹ بنک کھو چکی ہے اور باقی دینی سیاسی جماعتیں کتابی اور قانونی ہیں، عملاً زیادہ سیاسی وزن نہیں رکھتیں۔

موجودہ سیاسی کشمکش کا بہتر حل یہ ہے کہ جب تحریک انصاف ضمنی انتخابات میں اور ملک گیر جلسوں میں اپنی مقبولیت ثابت کر چکی ہے تو اسٹیبلشمنٹ کو چاہیے کہ وہ نئے انتخابات کا اعلان کروا دے اور جو جیتے اس کے ساتھ تعاون کرے۔ اگر تحریک انصاف لانگ مارچ کرتی ہے اور اسٹیبلشمنٹ اسے کچلنے کا فیصلہ کر لیتی ہے تو اس سے سیاسی اور معاشی عدم استحکام میں مزید اضافہ ہوگا اور مسائل پیچیدہ تر ہوتے چلے جائیں گے۔

ملک کا دینی بحران

جیسا کہ ہم نے عنوان میں لکھا کہ پاکستان اس وقت صرف سیاسی بحران کا شکار نہیں دینی بحران کا بھی شکار ہے۔ اور وہ دینی بحران وسیع تر ہے یعنی صرف اتنا ہی نہیں کہ ہماری حکومت

وریاست دینی احکام پر عمل نہیں کررہی۔ظاہر ہے دین اور اس کے تقاضے وسیع تر ہیں۔حکومت وریاست تو صرف دینی زندگی کا ایک جزو ہیں۔دینی لحاظ سے بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کیا ہم اچھے اور باعمل مسلمان ہیں؟ کیا ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کا حق ادا کررہے ہیں؟ اس ملک کا دینی بحران یہ ہے کہ ہم (یعنی پاکستانی مسلمان) دن بدن دین سے دور ہورہے ہیں اور اسلام کو چھوڑ کر ماسوا اسلام خصوصاً مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کو اپنارہے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی عبادت واطاعت کے لیے پیدا کیا تھا لہٰذا ہم سب مسلمانوں کا بنیادی نصب العین اور ہدف وغایت یہ ہونی چاہیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کریں۔

ہمارے ہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا یہ حال ہے کہ ہمارے پانچ سات فیصد سے زیادہ لوگ نماز نہیں پڑھتے۔اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب قرآن حکیم، جو ہماری ہدایت کا منبع ہے، اس سے ہماری دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ ہمارے معاشرے میں ایک فیصد بھی ایسے افراد نہیں پائے جاتے جو قرآن کو اس کی زبان میں پڑھ کر سمجھ سکتے ہوں۔اور دائرۂ اطاعت یعنی اخلاق ومعاملات میں ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ اخلاقی بحران کا شکار ہے۔جھوٹ اور غیبت ہمارا معمول ہے۔فحاشی، عریانی اور زنا کی ہمارے ہاں کثرت ہے۔کرپشن، فراڈ، چوری، قول وفعل میں تضاد اور حقوق کی عدم ادائیگی ہماری عادت ثانیہ بن چکی ہے۔دوسروں پر ظلم وزیادتی اور ان کے حقوق غصب کرنے کو ہم بہادری سمجھتے ہیں۔غرض نہ ہم انفرادی زندگی میں اسلامی احکام پر عمل کرتے ہیں اور نہ اجتماعی زندگی میں یعنی معاشرے اور ریاست میں جو ہمارا کردار ہو اس میں۔

بحران کے اسباب

اس دینی بحران کا سبب بلکہ اسباب کیا ہیں؟ ان اسباب کو ہم بہتر سمجھ سکیں گے اگر ہم تین پہلوؤں سے اس کا جائزہ لیں یعنی عوام کی ذمہ داری، علماء اور دینی قوتوں کا کردار اور حکومت وریاست کا رویہ۔اب ہم ان تینوں کے بارے میں اختصار سے اظہار خیال کریں گے۔

* ہمارے ہاں عوام یعنی ایک عام مسلمان فرد کو جاننا چاہیے کہ بحیثیت مسلمان دین پر عمل اس کی ذاتی ذمہ داری ہے۔قبر میں اور حشر میں اس سے حساب بطور ایک فرد لیا جائے گا۔وہاں اس کا یہ عذر مقبول نہ ہوگا کہ علماء نے اس کی صحیح رہنمائی نہیں کی یا حکمرانوں نے اسے غلط راستے پر

ڈالا۔نہیں! وہاں اس سے حساب بطور فرد لیا جائے گا کہ اس نے اللہ کی عبادت واطاعت کا حق ادا کیا یا نہیں؟

* اس صورت حال کے ذمہ دار ہمارے علماء کرام اور دینی جماعتیں بھی ہیں۔ان کی جو بھی پوزیشن ہے کوئی مسجد میں امام اور خطیب ہے، دینی مدرسے میں استاد ہے، تبلیغی ودعوتی جماعت کا کارکن ہے یا دینی سیاسی جماعتوں کا عہدیدار ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا ان لوگوں نے مؤثر طور پر عامۃ الناس کی دینی تعلیم وتربیت کا حق ادا کیا ہے کہ وہ اچھے اور باعمل مسلمان بنتے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کا حق ادا کرتے؟ ہمارا جواب نفی میں ہے (اور کوئی بھی عاقل اور غیر جانبدار شخص اس کا جواب ''ہاں'' میں نہیں دے سکتا)۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا تصورِ دین ناقص ہے، ان کی حکمت عملی اور لائحہ عمل غیر مؤثر ہے۔اس لیے وہ ڈیلیور نہیں کر پا رہے۔

* اس کے ذمہ دار ہمارے حکمران طبقے بھی ہیں جنہیں اپنی دینی ودنیوی ذمہ داریوں کا احساس نہیں اور وہ اسلام کی نصرت اور مسلمانوں کی خیر خواہی کرنے کی بجائے دنیا پر غالب اہل مغرب اور ان کی الحادی فکر وتہذیب کی پیروی کرنے کو صحیح طرزِ عمل سمجھتے ہیں۔مسلم ریاست میں ایسے حالات پیدا کرنا کہ وہاں کے مسلمان دینی احکام پر عمل کریں، یہ ان کی ترجیح ہی نہیں بلکہ عملاً ان کا طرزِ عمل مسلمانوں کو نامسلمان بنا رہا ہے اور دین سے دور کر رہا ہے۔

اس دینی بحران کا حل کیا ہے؟

نظری طور پر اس کا حل یہ ہے کہ جن تین سطحوں کا ہم نے ذکر کیا ہے یعنی عامۃ الناس (ہر مسلمان فرد)، علماء کرام اور دینی قوتیں (یعنی مساجد، مدارس، تبلیغی ودعوتی تحریکیں، دینی سیاسی جماعتیں) اور ہمارے حکمران طبقات (سیاستدان، عدلیہ، بیوروکریسی، فوج وغیرہ) ان میں سے ہر ایک اپنی اصلاح کرے اور اپنی اسلامی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی کوشش کرے۔

لیکن عمل کی دنیا میں ایسا ہوتا نہیں کہ محض کہہ دینے سے یا محض صحیح تجزیہ کر دینے سے کام بن جائے بلکہ کسی فرد یا طبقے کی بے عملی کو عمل میں ڈھالنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں دو طرح کی قیادت اہم ترین کردار ادا کرتی ہے اور انہی پر قوموں کی ترقی، عروج اور کامیابی کا دارومدار ہوتا ہے: ایک سیاسی قیادت اور دوسرے دینی

قیادت۔ ہمارے ہاں سیاسی قیادت چونکہ عالم گیر الحادی تہذیب کے غلبے کے آگے سرنگوں ہو چکی ہے اس لیے عامۃ الناس اور مسلم حکمرانوں کی اصلاح کے لیے ہماری ساری امیدیں اب دینی قیادت سے وابستہ ہیں۔ یہ ہماری دینی قیادت کا کام ہے کہ وہ عامۃ الناس کو اسلام سے جوڑے اور حکمرانوں کی بھی اصلاح کرے۔ اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ اس غرض سے علماء کرام اور دینی قوتوں کی موجودہ حکمت عملی اور لائحہ عمل غیر مؤثر اور ناقص ثابت ہو چکا لہٰذا انہیں اپنے لائحہ عمل کو Rethink اور Redesign کرنا ہوگا۔ مطلب یہ کہ انہیں اپنی حکمت عملی اور لائحہ عمل پر تفکیرِ نو اور تشکیلِ نو سے کام لینا ہوگا۔ اس موضوع کی اہمیت اور طوالت کے پیش نظر ہم اسے اپنی کتاب ''پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟ ایک تجزیہ'' میں زیر بحث لائے ہیں (یہ کتاب ہمارے مکتبہ البرہان سے معمولی قیمت پر دستیاب ہے)۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ علماء کرام اور دینی جماعتیں اور تحریکیں اپنے تصورِ دین کو جامع بنائیں اور عوام وخواص کی دینی تعلیم وتربیت (بذریعہ تعلیم، دعوت، میڈیا، تزکیۂ نفس) پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔ حکومت وریاست کی اصلاح اور اس کی قوت کو اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کرنا بھی اہم اور ضروری ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ افراد امت کی اصلاح کی جائے اور انہیں دین کے جامع تصور سے جوڑا جائے کیونکہ جب تک فرد کی اصلاح نہ ہوگی، معاشرے اور ریاست کی اصلاح بھی نہ ہو سکے گی کیونکہ معاشرہ اور ریاست تو افراد ہی سے مل کر بنتے ہیں اور افراد ہی انہیں چلاتے ہیں۔ اور یہی بات نقل وعقل سے بھی ثابت ہوتی ہے۔

اہل علم ودانش سے درخواست ہے کہ پاکستان کے سیاسی ودینی بحران سے نمٹنے کے لیے وہ ہماری ان تجاویز پر غور فرمائیں۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العٰلمین۔

تعلیم و تربیت

محمد دین جوہر

جدید تعلیم ۔ چند اخلاقی اور فکری مباحث

سوالاً جواباً

استاد اور ادارہ

سوال: پرانے زمانے میں طالب علم ''استاد سے تعلیم'' حاصل کرنے جاتا تھا اور اب وہ ''ادارے میں تعلیم'' پانے جاتا ہے۔ یہ کوئی مختلف چیزیں ہیں؟ اور اگر مختلف ہیں تو یہ فرق کیا اور کہاں پر ہے؟ آپ کا تجربہ اور آگہی کیا کہتی ہے؟

جواب: جدید عہد کے آغاز سے قبل، تعلیم کا منہج اور استناد دونوں استاد کی ذات میں تھے۔ تعلیم ہماری معاشرت کا حصہ تھی یعنی تعلیم ایک معاشرتی عمل تھا۔ تعلیم کی ایک سیاسی عمل کے طور پر تشکیل جدیدیت سے خاص ہے۔ ہماری روایتی معاشرت چند بنیادی اقدار اور ان اقدار سے پیدا ہونے والے شخصی، سماجی اور ثقافتی رویوں اور اعمال و رسومات کا مجموعہ تھی جس میں تعلیم ایک عنصر کے طور پر داخل تھی یعنی ہماری تعلیم معاشرت کا جزو تھی اور معاشرت تعلیم سے تشکیل نہیں پاتی تھی۔ اس معاشرت کو وسیع تر معنوں میں مذہبی معاشرت کہا جا سکتا ہے۔ پرانی ریاست کی وہ ضروریات جو تعلیم سے وابستہ تھیں، وہ بھی اسی معاشرت کے تابع تعلیم سے فراہم ہوتی تھیں۔ ہمارے روایتی تعلیمی عمل کی بنیاد ہمارا روایتی تصور انسان اور معاشرہ تھا۔ تصور معاشرہ دراصل انسانی تعلقات ہی کا ایک مربوط بیان ہوتا ہے۔ یہ معاشرت کسی سوشل کنٹریکٹ پر استوار نہیں تھی، کیونکہ اس کی بنیاد حقوق کا ایک ایسا تصور ہے جو سرتاسر قانونی اور سیاسی ہے۔ ہر قانونی چیز میں مرکزیت ریاست کو حاصل ہوتی ہے اور ہر اقداری چیز میں مرکزیت خدا کو حاصل ہوتی ہے۔ ''قدر'' اور ''قانون'' کی اساس پر تعمیر ہونے والے معاشرے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ قانون اساس اور ریاست مرکز معاشرت صرف خدا کو جلاوطن کر کے ہی تعمیر کی جا سکتی ہے۔

ہماری روایتی تعلیم ''تعلق انسانی'' کے ایک خاص تصور پر استوار تھی۔ استاد اور شاگرد کا تعلق ہمارے اہم ترین تہذیبی اداروں میں سے ایک ادارہ رہا ہے جہاں بچے کچھ ''سیکھتے'' نہیں تھے، بلکہ کچھ ''بنتے'' تھے۔ ''سیکھنے'' کا عمل مکمل طور پر ذہنی، تجریدی، انتظامی اور کمیتی ہے، جبکہ ''بننے'' کا عمل نفسی، اخلاقی اور اقداری ہے۔ ہماری پرانی تہذیب میں انسان بننے کا عمل اسی تعلیم کی

کیمیا گری تھی۔

اب بچہ سکول میں داخل ہوتا ہے،استاد کے پاس نہیں جاتا۔یہ ایک کائناتی تبدیلی ہے کیونکہ جدید سکول ایک آرگنائزیشن ہے جو تجرید کا نام ہے جس کی تشکیل انفس میں ممکن ہی نہیں، بلکہ یہ تجرید آفاق میں ایک ''ادارے'' کی ٹھوس شکل میں ہوتی ہے۔جدید تنظیم (Organizaiton)اخلاق اساس انسانی تعلق کے جبری انخلا کے بغیر متصور بھی نہیں ہوسکتی۔سکول ایک تجرید کے طور پر بچے کی پوری ذات کو محیط ہے اور یہ بنیادی طور پر اس کے ذہن اور نفس کی کایا کلپ کے وسائل اور ضروریات فراہم کرنے کے لیے وجود میں آتا ہے۔بچے''استاد سے پڑھنا''اور بچے کا''ادارے میں پڑھنا''دو بالکل مختلف سمتوں میں سفر ہے۔جدید معاشرے میں سکول کی آرگنائزیشن ایک ایسی مکمل تجرید بن چکی ہے جہاں کسی''قدر''کا گزر بھی ممکن نہیں۔سکول کا بنیادی مطلب ہی ایک انتظامی اور معاشی اختیار کو کام میں لاتے ہوئے ایسا سماجی ماحول مصنوعی طور پر پیدا کرنا ہے جہاں اقدار غیر اہم اور سماجی تجریدات اہم ہوجائیں، کیونکہ بچے کی انسانی حیثیت کا تعین اس کی ذہانت اور''تعلیمی کارکردگی''سے ہوتا ہے اور اس کی نفسی تشکیل مسابقت کے اصول پر ہوتی ہے۔

اس تجریدی کائنات میں کچھ اہداف تعلیمی مقاصد کے طور پر قائم کیے جاتے ہیں جو تعلیمی ادارے کی بنیادی ترین اقدار بن جاتی ہیں۔یہ اہداف بنیادی طور پر نفسیاتی (Psychic) ہوتے ہیں اور سکول کا اصول حرکت انھی سے اخذ ہوتا ہے۔ان میں سرفہرست مسابقانہ کامیابی اور ترقی، ذہانت کی برتری اور ڈسپلن ہیں۔سکول ایک ایسے سماجی ماحول کو ارادی اور مصنوعی طور پر پیدا کرنے کا نام ہے جہاں تقویٰ غیر اہم بلکہ غیر ضروری اور تکاثر اہم ترین بلکہ واقعاتی طور پر مقصودِ حیات بن جائے۔جدید تعلیم بچے کو شعور اور نفس انسانی کی ہر ماورائی اصل سے کاٹ کر بار برداری کا ایک''خرِ نا مشخص''بنانے کی سیاسی اور معاشی تدبیرات کا نام ہے۔

سوال:اس پس منظر میں یہ سوال بہت اہم ہوجاتا ہے کہ جدید تعلیم کے پورے عمل میں استاد کا کوئی عمل دخل کہاں تک ہے؟

جواب:جدید تعلیمی عمل،سرمایہ داری عمل پیداوار کی ایسی تام مثال ہے کہ جو شعبۂ خدمات میں واقع ہوتی ہے۔جدید تعلیمی عمل میں کوئی ایک نقطہ بھی ایسا نہیں ہے جو استاد کے لیے مختص کیا گیا ہو۔دوسرے لفظوں میں جدید تعلیم کا پورا عملی اور فکری جغرافیہ کوئی ایسی گنجائش (Space)نہیں

رکھتا جو استاد کے لیے خاص ہو۔ اس بات کو زیادہ تفصیل اور اپنی پوری معنویت کے ساتھ سمجھنے کی خاطر جدید تعلیمی عمل کی کچھ تفصیل عرض کرنا ضروری ہے۔ جدید تعلیمی عمل کے مندرجہ ذیل حصے ہیں یعنی خود تعلیمی عمل اور اُس کے اجزاء مندرجہ ذیل ہیں:

* تعلیمی عمل کا ماہیہ یا محتویٰ (Content)
* تعلیمی عمل میں واقع ہونے والی آموزش
* تعلیمی آموزش کا امتحان
* تعلیمی آموزش کا امتحانی استناد
* تعلیمی عمل میں ڈسپلن کا نفاذ

یہ تعلیمی عمل کے بنیادی ترین اجزا ہیں اور ان اجزا میں سے ایک جز کے صرف ایک حصے میں استاد کا عمل دخل پایا جاتا ہے۔ جب تعلیمی عمل کی اتنی گراریاں ایک نظام کی صورت میں چل رہی ہوں تو استاد انہی گراریوں میں کہیں کام آجاتا ہے۔ جدید تعلیمی عمل میں استاد کے لیے کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں وہ اپنے طالب علم سے انسانی بنیادوں پر تعامل اور تعاشر (Socialize) کر سکے۔ اسی لیے آج کل استاد کو''نالج ورکر'' (Knowledge Worker) یا (Facilitator) کہا جاتا ہے اور آج کا''نالج ورکر''، تقسیم محنت اور اس سے پیدا ہونے والی سفا کی کا اسی طرح شکار ہے جس طرح''صنعتی ورکر'' تھا اور ہے۔ استاد کا کام چونکہ تجریدات کے مکمل نقارخانے میں واقع ہوتا ہے، اس لیے اس میں پیدا ہونے والی روحانی، اخلاقی اور سماجی بیگانگی وجودی ابعاد اختیار کر لیتی ہے، جو ہمارے سماجی اور ثقافتی انتشار کو مزید گہرا بنا دیتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں ''استاد کے بحران'' کو اس تناظر میں دیکھے بغیر پورے تعلیمی عمل پر کسی بامعنی گفتگو اور درست نتیجے کا امکان نہیں۔ سرمایہ داری نظام نے استاد کو سکول کی تجریدات میں لپیٹ کر اسے''سیکولرائیزیشن'' کا سب سے بڑا ایجنٹ بنا دیا ہے۔ یہاں ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جدید معاشرے کا قیام تین انسانی کرداروں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ان میں سے پہلے نمبر پر ماسٹر صاحب ہیں اور دوسرے دو کردار وکیل اور صحافی ہیں۔

سوال: آپ کے خیال میں''استاد''اور''ادارے'' کا فرق بہت بدیہی اور اساسی نوعیت کا ہے۔ اس فرق کی وضاحت کو کن کن پہلوؤں سے آگے بڑھایا جا سکتا ہے؟

جواب: ''ادارہ'' ایک نئی اصطلاح ہے جو کہ بنیادی طور پر Institute یا Institution کے ترجمے کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ Institution کا لفظ عمرانیات میں سماجی، ثقافتی اور

مذہبی روایات کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے جو کہ یہاں مراد نہیں ہے۔

ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ جدید معاشروں کی بنیادی ترین ساخت ''آرگنائزیشن'' ہے، جو کسری کام اور مجموعی انتظام سے مل کر بنتی ہے۔ ''آرگنائزیشن'' میں تھوڑی بہت تبدیلی کرتے چلے آئیں تو ''ادارے'' بنتے چلے جاتے ہیں۔ سب سے پہلا جدید ''ادارہ'' بیوروکریسی پر مبنی ریاست تھی۔ اسی طرح سکول، بینک، فیکٹری، عدالت، یونیورسٹی، ہسپتال، پولیس، فوج، ریلوے، ڈاک خانہ، اخبار، ٹیلی وژن وغیرہ وغیرہ سب بڑے سائز کی ''آرگنائزیشنیں'' ہی ہیں جن کو ہم ''ادارے'' کہتے ہیں۔ لہٰذا عمومی طور پر ''ادارے'' کا لفظ ان ریاستی اور غیر ریاستی اجتماعی، معاشی اور سماجی ساختوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جن کا مقصد قانون بنانا، قانون کو نافذ کرنا، معاشی معاملات چلانا، خدمات فراہم کرنا وغیرہ ہوتا ہے۔ مثلاً یونیورسٹی ایک ایسی ''آرگنائزیشن'' یا ادارہ ہے جہاں علم کی پیداوار، کچھ ضروری فرق کے ساتھ، اسی طریقے پر ہوتی ہے جس طریقے پر گنے سے چینی بنانے والا ادارہ کام کرتا ہے۔ اسی طرح انسانی جان کو زندہ رکھنے کے لیے بھی ایک ''ادارہ'' کام کرتا ہے جس کو ہسپتال کہا جاتا ہے۔ ''پیداوار'' یا ''خدمت'' کے فرق کی وجہ سے ان اداروں میں فرق لانا پڑتا ہے لیکن بنیادی طریقہ کار ایک ہی ہے۔ لہٰذا ''اداروں'' میں اختیار، اقتدار، معاش اور خدمات وغیرہ کی سب اجتماعی ساختیں شامل ہیں بھلے وہ پبلک شعبے میں کام کرتی ہوں یا نجی شعبے میں۔ ''ادارے'' کا مقصد کوئی نہ کوئی معاشی، قانونی، اقتداری یا کوئی اور کمیتی سرگرمی ہوتی ہے۔ ''ادارے'' کے قیام کا جواز صرف اور صرف ایک کام ہوتا ہے جس کو روبکار انتظام سے ممکن بنایا جاتا ہے۔

لہٰذا اگر ہم لفظوں کے اس گورکھ دھندلے سے نکلیں اور صرف ایک لفظ استعمال کریں جو ان ساری سماجی، معاشی اور ریاستی ساختوں کو مکمل طور پر بیان کرتا ہو تو ہماری گفتگو آسان ہو جائے گی۔ وہ لفظ ''آرگنائزیشن'' ہے۔ آج کے ریاستی، سماجی، معاشی اور تعلیمی ڈھانچے میں آرگنائزیشن جس چیز کا نام ہے ہم اس کی تفصیل میں نہیں جائیں گے، کیونکہ اس وقت ہمارے سامنے ''استاذ'' اور ''ادارے'' کا فرق معلوم کرنا ہے۔

ہمارے خیال میں ''استاذ'' اور ''ادارے'' میں اتنا ہی فرق ہے جتنا انسان اور اس کے سائے میں ہوتا ہے۔ آج کا ''ادارہ'' ایک طاقتور اور نفوذ گیر تجرید ہے جو معاشرے کے ہر کونے کھدرے میں یہاں تک کہ فرد کی ذات کے ہر طاق اور طاقچے میں سرائت کر جاتی ہے۔

''آرگنائزیشن'' طاقت، غلبے اور مفاد کا طویل تر ہوتا ہوا خون آلود پنجہ ہے جو انسان کی پوری حیات کو آکاس بیل کی طرح لپیٹ لیتا ہے اور لحظہ لحظہ اس سے اجزائے حیات اور اجزائے انسانیت کشید کر کے الگ کر دیتا ہے۔ ''آرگنائزیشن'' کا ورد وظیفہ Efficiency ہے اور اس کا دباؤ اس قدر ہوتا ہے کہ انسان میں اخلاقی، جمالیاتی اور روحانی اجزا تقطیر ہو کر الگ ہو جاتے ہیں، اور بہیمی اور میکانکی اجزا غالب آجاتے ہیں۔ ''آرگنائزیشن'' کے قیام کے لیے انتظام اور کام کو ایک Formality اوڑھائی جاتی ہے جو رسومیات یعنی Ritualization کے دھنک رنگ سراب سے مستعار ہوتی ہے۔ ادارے کی کارکردگی کی بنیاد ایک ایسی شائستگی (Formal Politeness) پر قائم کی جاتی ہے جو اخلاقیات اور انسانی جذبات سے عاری ہوتی ہے اور اس کی دبازت ایک پرتو سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس پرتو کے پیچھے کارفرما واقعاتی انسانی حقیقت یعنی Actualized human reality بالکل مشینی اور بہیمی ہوتی ہے۔

''ادارے'' کو دیکھنے کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ یہ دائرہ در دائرہ ایک ایسا تخیلاتی جغرافیہ ہے جہاں سے معاشرت، اخلاق اور کردار کو بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ ادارہ چونکہ تعلق انسانی کی فنا پر استوار ہوتا ہے اس لیے اس کے ماحول میں کسی طرح کی معاشرت کے، جو اپنی جڑیں اقدار اور نفس انسانی میں رکھتی ہے، پنپنے کا امکان نہیں ہوتا۔

یہ بات تو ادارے میں کام کے حوالے سے تھی۔ اب ادارے کو انتظام کے تناظر میں دیکھنا بھی ضروری ہے۔ انتظام دراصل کسی نہ کسی تجرید کے جھنڈے کو مضبوطی سے پکڑ کر رکھنے اور اسے ہر وقت لہرائے رکھنے کا نام ہے۔ لیکن اس میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہوا اچھی ہو تو جھنڈا لہراتا رہتا ہے، لیکن اگر ہوا کم ہو جائے تو جھنڈے کا ڈنڈا ہاتھ میں لے کر اور کپڑے کا نقاب بنا کر کام میں لایا جاتا ہے۔ یہ ڈنڈا رولز کی قوت نافذہ ہے اور کپڑا انتظامی مفروضات کی آڑ کا نام ہے۔ انتظام کسی اخلاقی قدر پر استوار نہیں ہوتا، بلکہ انتظام پر ارتکازِ توجہ کی وجہ سے منتظم شخصی اخلاقی اساس ہی سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ادارے کے قیام اور معاشرت کے قیام میں بدیہی فرق ہے جس پر گفتگو ضروری ہے، لیکن اس کا یہ موقع نہیں ہے۔

ہم نے دیکھا کہ اسکول جدید معاشرے کا ایک بنیادی ادارہ ہے۔ آج کے تعلیمی ادارے میں آموزش کا عمل کچھ لفظ اور فارمولے سیکھنے، کچھ ظاہری رویوں کو وقتی طور پر نئی ترتیب دینے اور بچے میں کچھ خاص قسم کے Psychic رویے پیدا کرنے کا نام ہے۔ ہر ادارے کی طرح، جدید

تعلیمی ادارے کے قیام سے لے کر آموزش کے عمل تک سارے Processes ادارے سے باہر موجود کسی مقتدرہ کی ترجیحات کے مطابق سرانجام دیے جا رہے ہوتے ہیں اور انتظام بھی ادارے کے اندر اسی مقتدرہ کے نمائندے ہی کا نام ہے۔ چونکہ اس آموزشی عمل کے استناد میں بھی ادارے کے اندر موجود عاملین کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا، اس لیے ادارے کے اندر عمل آموزش کے دوران میں استاد اور طالب علم جس پہلی چیز کا تحقق حاصل کرتے ہیں وہ وجودی بیگانگی ہوتی ہے، جو صنعتی مزدوروں میں پیدا ہونے والی معروف بیگانگی سے زیادہ گہری اور دور رس نتائج کی حامل ہے۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے ہمیں یہ بات معلوم ہوگئی کہ ''استاذ'' اور ''ادارے'' میں کیا فرق ہوتا ہے۔

ہماری پرانی اور موجودہ بدحال روایت میں استاد اور شاگرد ایک انسانی رشتے کا نام تھا جو سماجی بھی تھی، اخلاقی بھی اور روحانی بھی۔ عرض ہے کہ یہی قریۂ تعلق معنی کی راہ گزر ہے۔ یہی وہ کشت شاداب ہے جہاں انسان ایک اکھوے کی طرح پھوٹتا ہے اور تناور درخت بن جاتا ہے۔ کلچر اور سماج کی یہ فضا ''ادارے'' کی فضا سے قطعی مختلف ہوتی ہے اور ان دونوں کے مابین نوری سالوں کا فاصلہ واقع ہے۔ استاد اور شاگرد کا تعلق، ہر انسانی تعلق کی طرح، کسی تجریدی جغرافیہ میں قائم نہیں ہوسکتا۔ اس تعلق میں طالب علم انسان ہونے کے معانی دریافت کرتا ہے اور ان کے کرداری تحقق کے راستے پر گامزن ہوتا ہے۔ آج کے عہد میں قائم ہونے والے اداروں میں استاد اور شاگرد کے تہذیبی پس منظر میں قائم ہونے والے اس تعلق کی گنجائش صفر ہے کیونکہ اداروں کا مقصود ہی آموزش کے عمل کو Impersonal بنانا ہے تاکہ طالب علم بعد میں جدید معاشروں کے سارے اداروں میں بلا چوں و چرا اور بغیر کسی قلق اور ملال کے Adjust ہوتا چلا جائے۔

ہم نے ابھی جو گزارشات کی ہیں ان کی روشنی میں ہم اپنے موجودہ حالات کو بھی دیکھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ آج کے سرکاری تعلیمی ادارے اس کی سب سے بڑی مثال ہیں۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا ادارہ انتظام اور کام سے قائم ہوتا ہے، جس میں کسی اخلاق یا کردار وغیرہ کا کوئی گزر نہیں ہوتا۔ ہمارے سرکاری اداروں کی ناکامی کی بنیادی وجہ چونکہ عدم انتظام ہے، اس لیے وہاں کام بھی اپنی موت آپ مر گیا ہے۔ اگر وہاں کسی انسانی اخلاق، کردار یا قدر کا گزر ہوتا تو اسے انتظامی ناکامی کے دوران میں ظاہر ہونا چاہیے تھا، یعنی اگر ہمیں وہم ہو کہ جدید اداروں میں اخلاق نام کی کوئی چیز ہوتی ہے تو اسے انتظام کی عدم موجودگی میں کام کو سنبھالنا چاہیے تھا۔ وہاں چونکہ انتظام کمزور یا غیر موجود ہے، لہٰذا کام بھی خاطر خواہ نہیں ہوتا۔ وہاں اتنی بڑی ناکامی کے وقوع پذیر ہوتے ہوئے کوئی

اخلاق، کردار، یا قدر کسی بھی سطح پر ظاہر نہیں ہوئی۔ یہی حال باقی اداروں کا ہے۔

سوال: ''آرگنائزیشنوں'' کی عالمگیر افزائش اور افراط میں روزگار کا مسئلہ بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا استاد خودمختار ہوتا ہے یا ملازم؟

جواب: یہ سوال ہمارے خیال میں اہم ترین ہے۔ اگر اس کو درست طور پر سمیٹا جائے تو اسی سوال سے حاصل ہونے والی بصیرت جدید تعلیم پر ایک روزن تو کیا ایک پورا در وا کر سکتی ہے۔ ہم سب سے پہلے یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ عصرِ حاضر کے معاشی نظام کی آرگنائزیشنوں میں ملازم سے کیا مراد ہے؟

آج کے معاشی نظام میں، کم از کم ترقی یافتہ معاشروں میں، ذاتی ملازم کا تصور ختم ہو گیا ہے، کیونکہ ملازمت کے ''ذاتی'' ہونے سے انسانی سطح پر کسی نہ کسی طرح کے تعلق کا خدشہ برقرار رہتا ہے۔ اب ہر آدمی کسی نہ کسی آرگنائزیشن ''میں'' ملازم ہوتا ہے۔ ہفت روزہ اکانومسٹ کی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۰۰ء میں امریکہ میں ۸۷ فیصد لوگ اپنا کام کرتے تھے، یعنی کہیں ملازمت کے بغیر اپنا آزادانہ کام کر کے روزی کماتے تھے، اور صرف ۱۳ فیصد لوگ نوکری کرتے تھے جبکہ ۲۰۰۱ء میں امریکہ میں ۹۲ فیصد لوگ نوکری کرتے ہیں اور صرف آٹھ فیصد لوگ اپنا کام کرتے ہیں۔ یہاں سے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ معاشی معاملات میں ''خودمختاری'' کتنی باقی رہ گئی ہے۔

تو مَیں عرض کر رہا تھا کہ ملازم ضرورت مند کو کہتے ہیں جو اپنی محنت یا ہنر کو بیچ کر روزی کماتا ہے۔ ملازمت انسانی بنیادوں پر کسی تعلق کا نام نہیں ہے بلکہ یہ مطلقاً ایک ضرورت کا رشتہ ہے۔ ملازم کسی چیز کا مصدر نہیں ہوتا، یعنی وہ کوئی چیز دینے والا نہیں بلکہ لینے والا ہوتا ہے۔ ملازمت کا لفظ آتے ہی پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ معاوضہ کیا ہے؟ ملازم اچھے معاوضے اور تحفظ کی خاطر ہر چیز پر Compromise کر لیتا ہے۔ ملازم کے نزدیک بہتر سے مراد صرف بہتر معاوضہ ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ملازمت اور معاوضہ ایک بنیادی ترین قدر ہے، جو آہستہ آہستہ انسان کی نفسی کائنات کا مرکز بن گئی ہے اور جدید معاشرے اور معاشرت کی اساس اب یہی نوکری ہے۔

روایتی معاشرے میں استاد اپنی ذات میں بیک وقت منبع، نمائندہ اور وارث ہوتا تھا۔ وہ ثقافتی اور تہذیبی اقدار کا منبع، اخلاقی اقدار کا نمائندہ اور ہدایت کا وارث تھا۔ یہ وہ مقام ہے جو

جدید معاشرے میں ملازم کی نہ صرف رسائی بلکہ فہم سے بھی باہر ہے۔استاد کچھ دیتا تھا، لیتا نہیں تھا۔ ملازم کی زندگی کا محور کچھ لینا ہوتا ہے۔ یہاں اس تاریخی صورت حال کے بارے میں جہاں یہ دونوں انسانی کردار ظہور کرتے ہیں، ایک بدیہی بات عرض کرنا ضروری ہے۔استاد معاشرت کا مرکز ثقل تھا اور معاشرت اپنی تمام معنوی گہرائیوں اور وسعتوں کے ساتھ جو مرادات رکھتی تھی وہ استاد کی ذات سے وابستہ ہوتی تھیں۔ معاشرت میں نظام حفظ مراتب ایک اہرام کی طرح تھا اور اس کی چوٹیاں استاد کے لیے مخصوص تھیں۔وہ انسانی اجتماع جس کی بنیاد معاشرت پر استوار کی گئی ہو، وہ اجتماع استاد کو ہر چیز سے عزیز رکھتا ہے۔دوسری طرف ملازم کا تاریخی تناظر بالکل مختلف ہے۔اس کے ملازمتی تناظر میں افقی محور معاش ہے اور عمودی محور حکم ہے۔یعنی ملازم پیسے اور حکم پر چلنے والا آدمی ہے۔اس تناظر سے باہر ملازم کا کوئی معنی نہیں ہے۔ملازم کے نزدیک تشکیل ذات کوئی معنی نہیں رکھتی، کیونکہ وہاں معرف تحفظ ذات ہے، جبکہ استاد کا مطلب ہی تشکیل ذات کے امکانات کو دریافت کرنا اور ان کو ایک تاریخی حقیقت بنانا ہے۔استاد لفظ و معنی کو کردار کا حضور اور تہذیب کا جمال عطا کرتا ہے۔ ملازم کے تصور کی پہنائیاں بھی یہاں تک باریابی نہیں پاتیں، کیونکہ وہاں یہ چیستاں ہے۔

اگر ایک اور تناظر میں دیکھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ استاد تعلق انسانی کے سارے ابعاد کو قائم کرتا ہے اور انہیں ان کی مطلوبہ بلندیوں پر برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے جبکہ ملازم تعلق کی عدم موجودگی کا نام ہے۔ملازمت میں حکم کی فرمانبرداری جبری ہے، تعلق میں اطاعت ہی کمال ہے۔ آج کے استاد اور اس کے پاس پڑھنے والے بچے ایک ''اِمپرسنل'' ماحول میں کام کرتے ہیں جہاں بیگانگی کی نحوست اس ماحول کے رگ و پے میں سرائت کر جاتی ہے۔آج کے عہد میں اگر کسی تعلیمی ادارے میں کام کرنے والا شخص اس دریائے آتش کو عبور کر لے تو وہ استاد ہے۔

سوال: کیا ملازم استاد ہو سکتا ہے؟

جواب: اگر کوئی ملازم استاد ہونا چاہے تو وہ یقیناً استاد ہو سکتا ہے۔اکبر الٰہ آبادیؒ نے کیا خوب کہا ہے:

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی آدمی بناتے ہیں

(بقیہ صفحہ نمبر:۲۱)

تعلیم و تربیت پروفیسر ملک محمد حسینؒ

طلبہ کی تربیت کیسے کی جائے؟

دہلی کی ایک کچی آبادی میں ایک چھوٹا سا پرائمری سکول تھا۔ اس میں 80 بچے زیر تعلیم تھے اور ایک استانی انہیں پڑھانے پر مامور تھی۔ اس دوران دہلی یونیورسٹی کے شعبہ عمرانیات کے ایک پروفیسر نے ایم اے کے طلبہ کو ایک تحقیقی منصوبہ دیا جس میں کچی آبادی کے اس پرائمری سکول کا معاشرتی اور تعلیمی دورہ بھی شامل تھا۔ شعبۂ عمرانیات کے طلبہ نے مذکورہ سکول کے 80 طلبہ کا گہرا مطالعہ کیا اور پھر ایک جامع رپورٹ تیار کر کے پروفیسر موصوف کو پیش کر دی۔ رپورٹ پر بحث کے دوران پروفیسر صاحب نے اپنے طلبہ سے پوچھا "ان 80 بچوں کا مستقبل کیا ہے"؟۔ طلبہ نے اس بات پر اتفاق کیا "ان بچوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ وہ گندے ماحول میں پلیں گے اور پھر اپنے والدین کی طرح عسرت زدہ زندگی گزار کر مر جائیں گے"۔

رپورٹ کی مجلد نقل شعبے کے کتب خانے میں رکھ دی گئی۔ اس واقعہ کو بیس سال گزر گئے تو ایک پروفیسر کو مذکورہ رپورٹ دیکھنے کا موقع ملا۔ انہیں خیال آیا کہ کیوں نہ اس رپورٹ کے نتیجے کا تعاقب کیا جائے۔ وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کچی آبادی کے پرائمری سکول کے 80 بچے اب کس حال میں ہیں۔ چنانچہ پروفیسر صاحب نے اپنی ایم اے کی جماعت کے طلبہ کو یہ تحقیقی منصوبہ دیا کہ وہ دیکھیں 80 بچے اب کہاں اور کس حال میں ہیں؟

جب یونیورسٹی کے طلبہ مذکورہ کچی آبادی میں پہنچے تو ان 80 بچوں کو تلاش کرنے لگے جو اَب جوان ہو چکے تھے۔ تلاش بسیار کے بعد انہیں 76 جوانوں کی بابت معلوم ہو سکا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔ طلبہ کو یہ جان کو خوشگوار حیرت ہوئی کہ تمام 76 نوجوان کامیاب اور خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ ڈاکٹر، کچھ انجینئر اور کچھ اکاؤنٹنٹ جبکہ باقی بھی اعلیٰ پیشوں سے منسلک تھے۔ جب دورے کی تازہ روداد یونیورسٹی پہنچی اور اس کا بیس سال پہلے کی رپورٹ کے نتائج سے موازنہ کیا گیا تو ظاہر ہے انتہائی ناقابل یقین صورت حال سامنے آئی۔ اب شعبۂ عمرانیات کے پروفیسر کو شک گزرا کہ ہو نہ ہو ان بچوں کی کامیابیوں کے پیچھے ضرور کسی استاد کا ہاتھ ہے۔ انہوں نے اپنے طلبا و طالبات کو حکم دیا کہ وہ اس پرائمری سکول کی استانی کو تلاش کریں۔

طلبہ آخر اُس استانی تک پہنچ ہی گئے جو بیس سال پہلے کچی آبادی کے غریب بچوں اور حال کے کامیاب نوجوانوں کو پڑھاتی رہی تھی۔ شعبۂ عمرانیات کے سربراہ پھر اس استانی سے ملنے بنفس نفیس تشریف لے گئے۔ پروفیسر صاحب نے اس بوڑھی عورت سے پوچھا کہ وہ کس طرح کچی آبادی کے ان غریب بچوں کی زندگی میں انقلاب لانے میں کامیاب ہوئی؟ بیس سال پہلے یہ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اعلیٰ عہدوں پر جا پہنچیں گے۔

ریٹائرڈ زندگی گزارنے والی اس بزرگ استانی نے جواب میں صرف اتنا کہا:

''مجھے ان بچوں سے پیار تھا''

طلبا و طالبات کے ساتھ استاد کا پیار کس طرح ان کی زندگی میں انقلاب برپا کرسکتا ہے یہ سچی داستان اس امر کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔

اسی نوعیت کا ایک دوسرا واقعہ بھی ملاحظہ کریں۔

بیگم ودیا سنہا سری لنکا کے ایک سرکاری ہائی سکول میں سنہالی (زبان) کی استانی تھیں۔ جب بھی ہر سال ان کی جماعت میں نئے بچے آتے تو وہ پہلے بچوں سے ایک ''کام'' ضرور کرواتی تھیں۔ آج بھی نئی جماعت میں ان کا پہلا دن تھا۔ بچوں سے تعارف کا مرحلہ ختم ہوا تو بیگم ودیا نے انہیں پہلا حکم یہ دیا'' اپنی اپنی کاپیوں سے ایک ورق پھاڑیئے اور اس پر پہلی سے لے کر آخری سطر تک یہ جملہ لکھئے: ''میں نہیں کرسکتا''۔

جب سب طلبہ یہ فقرہ لکھ چکے تو استانی نے کہا کہ اپنا اپنا ورق دو دفعہ تہہ کریں اور کونے میں پڑے گتے کے ڈبے میں ڈال دیں۔ سب بچوں نے حکم کی تعمیل کی۔ آخر میں خود بیگم ودیا نے بھی اپنا تہہ کیا ہوا ورق ڈبے میں ڈال دیا۔ اب انہوں نے ڈبے پر چاروں طرف گوند سے سفید کاغذ چپکایا اور اسے بند کردیا۔ پھر ایک طالب علم سے کہا کہ وہ جائے اور مالی سے پھاوڑا یا کدال لے آئے۔

جب کدال آ گئی، تو استانی نے وہ ڈبا اٹھایا جس میں ''میں نہیں کرسکتا'' والے ورق ڈالے گئے تھے اور جلوس کی شکل میں سب بچوں کو اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ استانی اپنے طلبہ کو صحن میں لے گئی۔ وہاں اس نے ایک کونے کا انتخاب کرکے تین صحت مند اور مضبوط بچوں سے کہا کہ وہ اس ڈبے کی جسامت کے مطابق گڑھا کھود دیں۔ جب گڑھا تیار ہوگیا تو استانی نے چار بچوں سے کہا کہ وہ بڑی احتیاط اور احترام سے گتے کا ڈبا گڑھے میں رکھ دیں۔ باقی بچوں سے کہا گیا کہ وہ ایک

ایک مٹھی مٹی گڑھے میں ڈالیں۔آخر میں کدال کے ذریعے باقی مٹی بھی گڑھے میں ڈال کر ڈبا دفن کر دیا گیا۔اس کے اوپر بچی کھچی مٹی سے قبر بنادی گئی۔

اب بیگم ودیا نے اس قبر کے اوپر ایک تختی لگائی جس پر لکھا تھا: یہ قبر جس شے کی ہے اس کا نام تھا''میں نہیں کرسکتا''۔تاریخ وفات 10اپریل 2000ء''۔بعد ازاں اسی قبر پر کھڑے ہو کر استانی نے اپنے شاگردوں کو ایک لیکچر دیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ ہم نے آج ''مَیں نہیں کرسکتا'' کو اس قبر میں دفن کر دیا ہے۔آج کے بعد ہم میں سے کوئی کسی کام کے سلسلے میں یہ نہیں کہے گا کہ ''مَیں نہیں کرسکتا۔''

''مَیں نہیں کرسکتا'' کی تجہیز وتکفین کے بعد یہ معمول ہوگیا کہ جب بھی کوئی طالب علم کہتا کہ وہ گھر کا کام نہیں کرسکا یا اسے فلاں سوال نہیں آتا یا وہ یہ سب کچھ نہیں کرسکتا،تو بیگم ودیا اسے یاد دلاتیں۔'ارے بھئی''میں نہیں کرسکتا''کو تو ہم دفن کر چکے لہٰذا اب اسے تو الزام نہ دو'۔اس طرح آہستہ آہستہ پوری جماعت کے تمام بچوں میں خوداعتمادی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔جلد ہی بچوں کا اکتساب علم پہلے سے کہیں بہتر ہوگیا۔آپ نے دیکھا کہ کس طرح ایک استانی کی جدت پسند سوچ نے ایک عملی سرگرمی کے ذریعے طلبہ کے رویے اور سوچ میں انقلابی تبدیلی پیدا کر ڈالی۔ہمارے اساتذہ بھی ان روشن مثالوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

بقیہ: جدید تعلیم - چند اخلاقی اور فکری مباحث

نہایت افسوس کا مقام ہے کہ آج کل جدید معاشروں میں استاد کو''نالج ورکر'' کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آج کا استاد اپنے طالب علم کو چند لفظ سکھانے کی مزدوری کرتا ہے اور یہ لفظ سکھانے کا طریقہ اسے سرکاری یا تنظیمی طور پر بتادیا جاتا ہے۔روزمرہ کام کے بعد یہ''نالج ورکر'' اپنی''ڈیوٹی''پوری کرلیتا ہے اور اس کے بعد وہ اپنی زندگی میں مکمل طور پر آزاد ہوتا ہے اور کسی طرح بھی اپنے طالب علم کے ساتھ جڑا ہوا نہیں ہوتا۔جدید تعلیم میں استاد کا تعلق شاگرد سے قانونی اور تنظیمی نوعیت کا ہے، معاشرتی نہیں ہے۔استاد ملازم صرف اس وقت ہوسکتا ہے جب انسانی اجتماع سے معاشرت کا خاتمہ ہو جائے اور فرد کا فرد سے کوئی تعلق باقی نہ رہے۔(سہ ماہی''جی'' جنوری ۲۰۱۳ء)(جاری ہے)۔

تعلیم و تربیت

حسیب احمد حسیب

مفتی تقی عثمانی صاحب کی پسند فرمودہ

محمد حسن عسکری کی 'جدیدیت' بطور درسی کتاب

برائے مدارس دینیہ

فکر وفن کے میدان میں پروفیسر حسن عسکری مرحوم ایک بڑا نام ہیں۔علم وادب کے دائرے میں ان کا کردار ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ پروفیسر صاحب ان چند لوگوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے نہ صرف فکر وفلسفے اور علم وادب کے میدان میں بڑا کام کیا بلکہ وہ اس دائرے کے آدمی ہوتے ہوئے مذہب بیزار نہیں تھے بلکہ ان کا شمار مذہب پسندوں میں کیا جاتا ہے۔

پروفیسر صاحب اور ان کی معروف کتاب جدیدیت کے حوالے سے یہاں پر گفتگو کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ابھی کچھ دن ہوئے صدرِ وفاق مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے اس کتاب کو کچھ اور کتب کے ساتھ مدارس کے طلباء کے لیے تجویز فرمایا ہے۔اس تجویز کے ساتھ ہی اس کتاب کے حوالے سے گفتگو کا ایک بازار گرم ہوگیا، بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے لیے بہت سے لوگ اپنے اپنے دائروں سے نکل کر اس کتاب کو لے کر محاضرات ،سیمینارز اور تجزیوں کی محافل سجانے لگے، یہ دیکھے بغیر کہ جس بات کا ڈول ڈالا جا رہا ہے اس کی عملی صورت کیا ہوگی اور وہ عملی صورت کس حد تک مفید ثابت ہوگی؟

یہ بات تو انتہائی خوش آئند ہے کہ ایک طویل عرصے کے بعد ان موضوعات کو چھیڑا جا رہا ہے جو دورِ جدید میں مذہب کے مقدمے کو لڑنے کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔کم سے کم درجے میں ان عنوانات پر تخصصات کا ایک سلسلہ تو شروع ہوا چاہتا ہے۔اس سے پہلے تو ہم کالم نگاری، صحافت، انگریزی، یوٹیوب اور بھانت بھانت کے جھمیلوں میں اپنا اور اپنے طالب علموں کا قیمتی وقت گنوا چکے ہیں یہاں تک کہ ہمارا ایک باصلاحیت طبقہ مدرسہ ڈسکورسز جیسے جھانسوں کا شکار ہو کر خود روایت سے تجدد کی طرف کوچ فرما چکا۔

گو کہ بڑی دیر کے بعد ہم نے یہ سلسلہ شروع کیا ہے لیکن اس میں کیا کچھ مسائل ہیں۔اس حوالے سے چند تحفظات پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

'جدیدیت' بطور کتاب

'جدیدیت' کو ایک مستقل کتاب قرار دینا ممکن نہیں گو کہ اس کتاب کی عام شہرت کی وجہ سے یہ بات شاید درست معلوم نہ ہو لیکن بہ نظر غائر تجزیہ کرنے کے بعد یہی رائے درست معلوم ہوتی ہے۔

'جدیدیت' کو زیادہ سے زیادہ ہم ایک طویل مضمون قرار دے سکتے ہیں جس میں مغرب کی فکری تاریخ کا ایک اجمالی خاکہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے دوسرے حصے میں فلسفہ مغرب کے کچھ عنوانات بیان ہوئے ہیں جو صرف اشاروں کی شکل میں ہیں۔ یہ بات توجہ طلب ہے کہ کیا یہ کتاب دینی مدارس کے لیے بطور درسی کتاب کسی بھی درجے میں مفید ثابت ہو سکتی ہے؟

کتاب کا پہلا حصہ فلسفۂ مغرب کی اجمالی تاریخ پر مبنی ہے جو حوالہ جات کے بغیر ہے۔ اسے صرف ایک شخص کی رائے یا حاصلِ مطالعہ کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔ مزید اس حوالے سے گفتگو اتنی آگے جا چکی ہے کہ آج اس اجمالی تاریخ کو تفصیل سے سمجھے بغیر جدیدیت کے عنوان کو سمجھنا مشکل ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ مغرب کے کچھ معروف فلسفوں کی طرف چند اشاروں پر مشتمل ہے جن کو ایک عام طالب علم کے لیے سمجھنا مشکل ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس کتاب کو بطور درسی کتاب پڑھایا جائے گا تو اشکالات دور ہونے کے بجائے مزید پیدا ہو جائیں گے۔

کیا 'جدیدیت' کو بطور نصابی کتاب پڑھایا جا سکتا ہے؟

بطور طالب علم فلسفۂ مغرب کے مطالعے اور بطور مدرس لامذہبی نظریات کی تاریخ و فلسفے کو پڑھانے کے بعد ایک زمانے میں یہ ارادہ ہوا کہ اردو میں ایک ایسی کتاب پڑھائی جائے جو فلسفہ مغرب کے مضر اثرات اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا توڑ پیش کر سکے۔ اردو زبان میں متعدد کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا احساس ہوا کہ ہم نے اس حوالے سے کوئی مواد تیار ہی نہیں کیا۔ یہ بات حیران کن بھی ہے اور افسوس ناک بھی کہ ہم نے مغربی فکر کی خرابیوں کا نہ تو درست ادراک کیا اور نہ ہی ان کا اثر توڑنے کے لیے کوئی خاص علمی مواد تیار کیا۔

اب اگر جدیدیت پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کتاب کو پڑھانے کے لیے ایسے اساتذہ کی ضرورت ہے جو خود فلسفۂ مغرب پر عبور رکھتے ہوں یعنی اس کتاب کو پڑھانے

والا ایک جانب تو مغربی مصادر کا براہ راست درک رکھتا ہو اور دوسری جانب اس کے علمی رد سے بخوبی واقف بھی ہو۔ یہ تو ممکن ہے کہ انفرادی سطح پر ہماری روایتی درسگاہوں میں ایسی علمی شخصیات موجود ہوں لیکن بحیثیت مجموعی ہمارے پاس ایسے اساتذہ موجود نہیں جو'جدیدیت' کو بطور نصابی کتاب پڑھا سکیں۔

دوسری جانب ہمارے عصری تعلیمی اداروں میں فلسفۂ مغرب کے حوالے سے بہت سی معتبر شخصیات موجود ہیں لیکن وہ مذہب کی کلامی روایت اور روایتی فکر سے کوسوں دور دکھائی دیتی ہیں، ایسی شخصیات سے ان کتب کا پڑھوانا درحقیقت جدیدیت سے تجدد کی طرف لے جانے کا ایک واسطہ ہی شمار ہوگا۔

'جدیدیت' کے فکری مسائل

گو کہ'جدیدیت' کو علمی حوالے سے ایک خاص مقام حاصل ہے خاص کر جب اسے صدر وفاق مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم جیسی بڑی شخصیت تجویز فرمائیں۔خود مفتی صاحب دامت برکاتہم کے الفاظ میں۔

''زیرنظر کتاب (جدیدیت) آج سے تقریباً گیارہ سال پہلے حسن عسکری صاحب مرحوم نے احقر کی فرمائش پر ترتیب دی تھی۔مرحوم کا موضوع اگرچہ ادب وتنقید تھا لیکن فلسفۂ مغرب پر بھی ان کی گہری نگاہ تھی اور فرانس کے ایک معروف فلسفی ''رینے گینوں'' نے جن کا اسلامی نام (شیخ عبدالواحد یحییٰ تھا)، مغربی فلسفے پر جو تنقیدیں کیں عسکری صاحب مرحوم نے نہ صرف ان کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تھا بلکہ وہ ان کے بے حد مداح بھی تھے۔''

آگے فرماتے ہیں:''احقر کو فرانسیسی زبان سے ناواقفیت کے سبب رینے گینوں کی کتب کے مطالعے کا موقع تو نہ مل سکا لیکن عسکری صاحب مرحوم جب بھی ان کی باتیں سناتے تو ان سے بڑی سلیم، متصلب اور بے آمیز دینی فکر جھلکتی نظر آتی تھی۔''

یہاں تک کی گفتگو سے چند نکات واضح ہوجاتے ہیں:

* پروفیسر حسن عسکری مرحوم نے'جدیدیت' رینے گینوں کے افکار سے متاثر ہو کر لکھی۔
* مفتی تقی عثمانی صاحب کا رینے گینوں کی فکر کا براہ راست مطالعہ نہیں تھا۔

* رینے گینوں کی فکر کے حوالے سے حضرت کی رائے عسکری صاحب کے تاثرات تک محدود تھی۔

اب یہاں پر کچھ امور کی وضاحت ضروری ہے۔ اول تو یہ کہ 'جدیدیت' نوے کی دہائی میں لکھی گئی اور آج جب 2022ء میں اسے تجویز کیا جا رہا ہے تو حضرت والا کی رینے گینوں کی بابت رائے ابھی تک حسن عسکری صاحب کے تاثرات تک ہی محدود ہے۔

رینے گینوں کون؟

شیخ عبدالوحد یحییٰ المعروف بہ René Guénon رینے گینوں (1951ء-1886ء) ممتاز و معروف فرانسیسی مسلم دانشور اور ماہر مابعدالطبیعیات تھے۔ آپ کو آنند کمار سوامی اور شون فریژوف کے ہمراہ مکتبۂ روایت پسندی (Traditionalist School) کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ روحانیات، علامات (Symbolism)، کونیات (Cosmology)، تصوف اور مشرقی مابعدالطبیعیات پر آپ نے دنیا کو نئی فکر سے روشناس کروایا۔

رینے گینوں کے حوالے سے ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ وحدیت ادیان کے انتہائی قریب چلے گئے تھے اور مغرب پر ان کی تنقید اسی مخصوص دائرے میں دکھائی دیتی ہے۔ ان کی فکر کی ایک جھلک ہم اس حوالے میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

''مغرب میں اس سوال (کہ روایت کیا ہے؟) کا جواب صرف ایک شخص نے دیا ہے اور مغرب اس شخص کی بات سننے سے انکاری ہے۔ میرا مطلب رینے گینوں سے ہے۔ وہ (رینے گینوں) کہتے ہیں کہ روایتی ادب اور روایتی فنون صرف روایتی معاشرے میں پیدا ہو سکتے ہیں اور روایتی معاشرہ وہ ہے جو مابعد الطبیعیات پر قائم ہو۔ مابعد الطبیعیات چند نظریوں کا نام نہیں۔ التوحیدُ واحدٌ۔ مابعدالطبیعیات صرف ایک ہی ہوسکتی ہے۔ یہی اصل اور بنیادی روایت ہے۔ اس کا تعلق کسی نسل یا ملک سے نہیں البتہ اس کے اظہار کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ اور ہندو روایت یا چینی روایت یا اسلامی روایت میں فرق انہی طریقوں کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلامی تہذیب میں خشکی ہے اور ہندو تہذیب میں حسیات کی رنگا رنگی ہے۔ لیکن اپنشد میں لکھا ہے کہ انسانی وجود کے مرکز میں نہ تو سورج کی روشنی ہے نہ چاند کی نہ ستاروں کی، بلکہ ہر چیز پُرش کے نور سے منور ہے۔ چنانچہ بنیادی روایت ہر جگہ وہی

ہے،صرف شکلوں کا فرق ہے'' (مضمون'روایت کیا ہے؟'' 'وقت کی راگنی ص ۱۰۸)

اس عنوان پر جلیل عالی صاحب نے انتہائی شاندار گفتگو فرمائی ہے۔

رینے گینوں کی فکر کا مطالعہ کرنے کے بعد جدیدیت کے حوالے سے بھی متعدد سوالات کھڑے ہو جاتے ہیں۔

'جدیدیت' میں کیا کمی ہے؟

جدیدیت یا ماڈرن ازم ایک خاص عنوان ہے اور اس عنوان کے دائرے میں مغرب کے مذہب سے فکری انحراف کی اجمالی تاریخ کو تو ضرور سامنے رکھا گیا ہے لیکن مشرق میں استشراق کے راستے سے آنے والی تجدد پسندی کی بابت اس کتاب میں گفتگو سے گریز کیا گیا ہے۔

سرسید سے پرویز تک اور مشرقی سے غامدی تک یہاں تک کہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ سے ڈاکٹر فضل الرحمان تک ہمارے یہاں مذہب کی تشکیلِ نو کے حوالے سے جو کچھ بھی گفتگو ہوئی ہے وہ اسلام کی روایتی کلامی فکر اور فلسفے سے کس حد تک مختلف ہے اور کس انداز میں تجدد پسندی کی اس لہر نے انکار روایت، انکار حدیث اور مسلم فکر و فلسفے کے انکار کا راستہ کھولا ہے، اس کتاب میں ان عنوانات کو سرے سے نہیں چھیڑا گیا یعنی ہمیں مغربی جدیدیت کی بابت تو کچھ نہ کچھ علم ضرور ملتا ہے لیکن مشرق میں اس کے کیا کچھ اثرات ہوئے اس حوالے سے یہ کتاب خاموش دکھائی دیتی ہے۔

دوسری جانب جدید الحاد و دہریت کے حوالے سے اس کتاب میں کوئی خاص مواد موجود نہیں ہے اور نہ ہی ان عنوانات پر یہ بہتر ذہن سازی کی صلاحیت رکھتی ہے۔

'جدیدیت' کو کیسے مفید بنایا جا سکتا ہے؟

یہ بات تو واضح ہے کہ اس کتاب کو پڑھانے کے لیے ایسے رجال کار کی ضرورت ہے جو فلسفہ مغرب سے بخوبی واقفیت رکھتے ہوں۔اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی کلامی روایت اور فکر و فلسفے کے بھی ماہر ہوں۔

دوسری جانب یا تو اس کتاب کی تسہیل کی جائے یا پھر 'جدیدیت' کو جدید انداز میں لکھا جائے تا کہ طالب علموں خاص کر مدرسے کے طالب علموں کے لیے یہ کتاب کسی درجے میں مفید ثابت ہو وگرنہ اس کتاب کا تجویز کیا جانا صرف ایک علامتی یا رسمی عمل بن کر رہ جائے گا۔

تعلیم و تربیت

آغا ندیم سحر

پاکستانی جامعات کی حالتِ زار

کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد طلبہ کی ایک بڑی تعداد جامعات کا رخ کرتی ہے تاکہ وہ کسی ایک شعبے میں تخصص حاصل کر کے ملک وملت کا نام روشن کر سکے۔ طلبہ اپنی علمی تشنگی دور کرنے کے ساتھ سماجی انقلاب کے خواہش مند بھی ہوتے ہیں اور سچ کے متلاشی بھی۔ وہ سوالات سوچتے بھی ہیں اور ان کے جوابات کے لیے کتب خانوں کا رخ بھی کرتے ہیں۔ جان ہنری نیومین نے اپنی کتاب 'آئیڈیا آف اے یونیورسٹی' میں لکھا ہے کہ ''یونیورسٹی کا بنیادی مقصد کسی بھی فرد کی فکر کی اس طرح پرورش کرنا ہے کہ وہ سچ کی تلاش کر سکے''، لہٰذا اس میں قطعاً دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ حقیقی طالب علم وہی ہوگا جو سچ کا متلاشی ہوگا۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری جامعات طلبہ کو سچ کے سفر پر روانہ کر رہی ہیں؟ پاکستان کے ۱۶۰ اضلاع میں ۱۴۲ یونیورسٹیاں (بشمول متصل ادارے) پہلے سے موجود ہیں۔ سرکار نے دس نئی جامعات کی منظوری دے دی ہے۔ ایک طرف یہ انتہائی احسن قدم ہے کہ سرکاری جامعات میں اضافہ ہو رہا ہے مگر کیا ہماری سرکار یا اعلیٰ تعلیم کی وزارت نے جامعات کی نصاب سازی، تعلیم کے طریقہ کار کو بدلنے اور اسے جدید بنانے کی زحمت کی؟ کیا سرکار نے پہلے سے موجود یونیورسٹیوں کی زبوں حالی پر کبھی سوچنے کی زحمت کی یا جامعات کی پریشان کن صورت حال پر چھپنے والی خبروں اور تجزیات کو کبھی سنجیدہ لیا؟ شاید میری طرح آپ کا جواب بھی منفی ہو۔

ہماری وزارت تعلیم ایک طرف تو پاکستانی جامعات کو ورلڈ رینکنگ میں سرفہرست دیکھنا چاہتی ہے اور دوسری طرف اس نے پہلے سے موجود یونیورسٹیوں کی زبوں حالی پر آج تک سوچنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ سلیکشن بورڈز سے لے کر تحقیقی جرائد اور تحقیقی مقالہ جات تک، ہر پہلو پر ایک عرصے سے سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔ بی ایس اور ایم فل کے لاکھوں طلبہ مارکیٹ میں بھیجے جا رہے ہیں مگر مارکیٹ انھیں قبولنے کو تیار نہیں۔ نجی و سرکاری جامعات سے فارغ التحصیل پی ایچ ڈی ڈاکٹرز جو ہزاروں صفحات کا تحقیقی مقالہ لکھ کر آتے ہیں اپنے ہی لکھے ہوئے ہزاروں صفحات کے مقالے کا دس سطروں میں ملخص تک پیش نہیں کر سکتے۔ جب محقق ۴۰ سے ۵۰ ہزار

دے کر ایکس اور وائی کیٹگری میں مقالہ (جو صرف بھوسہ ہوگا) چھپوائے گا تا کہ بعد میں ڈگری لے سکے تو اس محقق کے مقالات کی اہمیت و افادیت بھی ایسی ہی ہوگی۔ جامعات کے پاس ریسرچ جرنل چھاپنے کے پیسے نہیں اور محقق کا پیپر چھپنے کے قابل نہیں لہٰذا دونوں ایک دوسرے کی ڈیمانڈ پوری کر رہے ہیں۔ اس کے بعد مارکیٹ میں جو تحقیق آئے گی اس کا معیار کیسا ہوگا، یہ ہم ایک عرصے سے دیکھ رہے ہیں۔

ابھی دو روز قبل ایک خبر نظر سے گزری کہ جامعات کے تقریباً ۴۰ ہزار یونیورسٹی اساتذہ جو بی پی ایس پر ہیں' انھیں ترقی سے محروم رکھا جا رہا ہے جبکہ صرف بارہ فیصد طبقے کو بھاری تنخواہوں اور مراعات سے نوازا جا رہا ہے۔ اس خبر کے پیچھے کیا کہانی ہے وہ بھی سنتے جائیں۔ 2008ء میں ایچ ای سی نے ایک نیا نظام متعارف کروایا جسے ٹی ٹی ایس کا نام دیا گیا۔ اس نظام کے تحت ایک سیٹ اسسٹنٹ پروفیسر کے لیے مشتہر کی جاتی ہے جس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ مطلوبہ شخص پہلے بی پی ایس پر ہو اور یوں اسے ٹی ٹی ایس پر یونیورسٹی میں تدریس کا موقع دیا جاتا ہے۔ اسے مستقبل میں مشینی طریقے سے پروموشن بھی ملتی جاتی ہے اور اس کے برعکس بی پی ایس والے کے لیے ہر پروموشن میں سارا عمل از سر نو دہرایا جاتا ہے۔ اس سے نقصان یہ ہوا کہ بی پی ایس والے جو پہلے سے جامعات میں موجود تھے' وہ ابھی تک وہیں کھڑے ہیں اور ٹی ٹی ایس پر آنے والے مشینی ترقی سے پروفیسر بھی بن چکے۔ اس خبر کے پیچھے اور بھی کئی کہانیاں سننے کو ملیں۔ یہ صرف ایک خبر ہے۔ پچھلے چند ماہ میں پاکستان بھر کی جامعات سے ایسی درجنوں خبریں سننے کو ملیں۔ کہیں سلیکشن بورڈ پر سوالات' کہیں تحقیقی جرائد اور ان میں چھپنے والے مقالہ جات پر سوالات، کہیں جامعات میں نصاب سازی اور تعلیمی نظام پر تشویش اور کہیں جنسی ہراسگی کے واقعات، ایسا کیوں ہے؟

مَیں نے ایک ملاقات میں پنجاب ہائر ایجوکیشن کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر شاہد منیر کے سامنے بھی مذکورہ خدشات رکھے تھے۔ ان کے بقول کچھ باتوں میں سچائی نہیں جبکہ کچھ کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ہم بہتری لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اب وہ بہتری کب تک آئے گی؟ اس بارے میں خود ہائر ایجوکیشن کمیشن بھی خاموش ہے۔ گزشتہ برس ہائر ایجوکیشن کمیشن کو ۵۱ ارب روپے کی گرانٹ دی گئی۔ جامعات کے اپنے ذرائع سے حاصل ہونے والی کمائی الگ ہے۔ اس گرانٹ سے جامعات میں کون سی نئی تحقیق سامنے آئی یا کون سی نئی ایجاد ہوئی؟ یہاں بھی سوالیہ

نشان ہے۔ ہمارے فارغ التحصیل طلبہ جب فیلڈ میں نکلتے ہیں تو اندر سے خالی ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں کاغذ کی ڈگریاں تو ہوتی ہے مگر انٹرویوٹیبل پر پہنچ کرنا کام ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف ہمارے طلبہ کا یہ حال ہے اور دوسری طرف ہم خوش ہو کر قوم کو بتا رہے ہیں کہ ورلڈ رینکنگ میں پاکستان کی پہلی یونیورسٹی، دنیا کی اچھی یونیورسٹیوں میں چار سو نمبر پر کھڑی ہے۔ ہماری اکثر جامعات نئے علوم کی تشکیل، طلبہ کو سوال اور فکر کی آزادی دینے کی بجائے ان کے لیے مکالمے اور مباحثے کے دروازے بند کر رہی ہیں۔ کچھ جامعات میں چند اساتذہ اپنے طور پر یہ فریضہ نبھا رہے ہیں کہ اپنے طالب علموں کو ذہنی طور پر آزاد بنائیں، انھیں دولے شاہ کا چوہا بنانے کی بجائے ان کے اندر سوچنے سمجھنے اور سوال اٹھانے کی صلاحیت پیدا کریں مگر مجموعی طور پر صورت حال انتہائی افسوس ناک ہے۔ سرکار کو نئی جامعات کی منظوری سے زیادہ پہلے سے موجود جامعات کو جدید تر بنانا ہوگا، تعلیم کے میدان میں اگر انقلاب چاہتے ہیں تو عالمی معیارات کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں اپنی اصلاح کرنی ہوگی۔ ہمارے لیے بہت ضروری ہے کہ ہم مدرسہ، سکول، کالج اور یونیورسٹی میں فرق کرنا سیکھیں۔ اس سے شاید کچھ بہتری آئے۔ ہمیں سنجیدگی سے جامعات کے نظامِ تعلیم اور نظامِ تدریس کے بارے میں سوچنا ہوگا۔

بقیہ: مسلم خاندانی نظام کی تباہی کا سامان

۸۔ اس کنونشن کے مطابق عورت کو اسقاطِ حمل کا حق ہونا چاہیے جو صریحاً غیر اسلامی ہے۔

۹۔ اس کنونشن کے مطابق کنواری عورت کے، باہمی رضامندی کے ساتھ جنسی تعلقات (زنا) پر کوئی سزا نہیں ہونی چاہیے جبکہ اسلام میں یہ قابل سزا جرم ہے۔

۱۰۔ اس کنونشن کے مطابق عورت بھی جب چاہے مرد کو طلاق دے سکتی ہے، جب چاہے کسی دوسرے مرد سے شادی کر سکتی ہے جو کہ اسلامی قوانین کے خلاف ہے۔

۱۱۔ اس کنونشن کے مطابق عورت 18 سال سے پہلے شادی نہیں کر سکتی جبکہ اسلام میں بلوغت کے وقت نکاح کی اجازت ہے۔

اب اس بات پر غور کریں کہ اسلام اور اس طرح کا فیمن ازم کس طرح ایک ساتھ چل سکتے ہیں؟

تعلیم و تربیت

حافظ محمد عمران طحاوی

تدریس القرآن پراجیکٹ کی تقریب

گورنر ہاؤس لاہور کی ایک پُروقار تقریب میں الفلاح قرآن فاؤنڈیشن کی طرف سے گورنر پنجاب میاں بلیغ الرحمٰن نے مدیر البرہان کو لائف اچیومنٹ ایوارڈ اور گولڈ میڈل دیا

تدریس القرآن پراجیکٹ نے ترجمۂ قرآن کے پیغام کو عام کرنے کے لیے روزنامہ جنگ کے ساتھ مل کر ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ یہ پُروقار تقریب ۲۰/اکتوبر ۲۰۲۲ء کو سہ پہر تین بجے گورنر ہاؤس کے دربار ہال میں منعقد ہوئی جس میں قرآن حکیم میں دلچسپی رکھنے والے اہل علم، علماء کرام اور سکالرز نے شرکت کی۔ تقریب کی صدارت گورنر پنجاب انجینئر میاں بلیغ الرحمٰن نے کہا۔

مدیر البرہان نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہم نے مادی وسائل نہ ہونے کے باوجود سکولوں میں ترجمۂ قرآن کی ترویج کا آغاز ۲۰۱۸ء میں کر دیا تھا۔ الحمدللہ! اس میں ساتھی ملتے گئے اور پچھلے سال ہم نے ۹۸۰ سکولوں تک پہنچ کر وہاں ترجمۂ قرآن کی کلاسیں شروع کرائیں۔ ہم نے سکولوں کے غریب طلبہ کو نہ صرف ایک لاکھ سے زیادہ پارے بلا معاوضہ مہیا کیے بلکہ ان سکولوں میں اساتذہ کی تربیت بھی کی تاکہ ترجمۂ قرآن کے کام کو موثر اور مفید بنایا جا سکے۔ انہوں نے کہا کہ ہماری پوری کوشش ہے کہ نئی نسل کو قرآن حکیم سے جوڑ دیں تاکہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کر سکے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس کام کو مزید آگے بڑھانا چاہتے ہیں اور اہل دل کے تعاون کا خیر مقدم کریں گے۔

تقریب سے پروفیسر ڈاکٹر حسن مدنی، وقاص انجم جعفری اور مسلم لیگ (ن) علماء ونگ کے ڈاکٹر انتخاب احمد نوری نے بھی خطاب کیا جبکہ تقریب کے ماڈریٹر پروفیسر ایم اے رفرف صاحب تھے۔ گورنر پنجاب میاں بلیغ الرحمٰن صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے انہیں مرکز میں قرآن حکیم کی لازمی تدریس کا ایکٹ پاس کرانے اور سارے مسالک کے علماء کرام سے قرآن مجید کا متفقہ ترجمہ کرانے کی توفیق بخشی۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنی موجودہ حیثیت میں بھی جتنا ہو سکا قرآن مجید کی خدمت کا مشن جاری رکھیں گے کیونکہ اسی میں ہم مسلمانوں کی دنیا و آخرت کی فلاح ہے۔

فقہ و قانون ترجمہ: ڈاکٹر محمد امین، نظر ثانی: شعیب مدنی، سیف اللہ خالد

قومی اسمبلی سے منظور شدہ

ٹرانس جینڈر ایکٹ کا اردو ترجمہ

اسلام آباد، جمعرات، مئی 24، 2018ء

حصہ اول

ایکٹس، آرڈی ننس، صدارتی احکامات اور ضوابط

قومی اسمبلی سیکریٹیریٹ

اسلام آباد، 22 مئی، 2018ء

نمبر ایف 23(20)/2018ء قانون سازی: مجلسِ شوریٰ (پارلیمنٹ) کے مندرجہ ذیل قانون کو مورخہ 18 مئی، 2018ء صدارتی رضا مندی حاصل ہو چکنے کے بعد عوامی اطلاع کے لیے شائع کیا جاتا ہے۔

2018ء کا ایکٹ نمبر XIII

قانون

ٹرانس جینڈر افراد کے حقوق کے تحفظ، فلاح و بہبود، بحالی و امداد فراہم کرنے کے لیے اور ان تمام معاملات کے لیے جو ان سے بالواسطہ یا بلاواسطہ جڑے ہوئے ہیں، کے متعلق بنایا گیا ہے۔

اسے مندرجہ ذیل طریقے سے قانونی شکل دی جا رہی ہے۔

باب اوّل: ابتدائیہ

1۔ مختصر عنوان/ دائرہ عمل و اجراء

- اس قانون کا نام ٹرانس جینڈر افراد (تحفظ حقوق) ایکٹ ۲۰۱۸ء ہوگا۔
- یہ پورے پاکستان میں نافذ العمل ہوگا۔

- یہ فی الفور نافذ العمل ہوگا۔

2۔تعریفات(Definitions)

- اس قانون میں مذکور الفاظ واصطلاحات کا مفہوم درج ذیل ہوگا اِلّا یہ کہ کوئی بات موضوع یا سیاق وسباق کے منافی ہو۔

-**ایکٹ**(Act) سے مراد ہے ٹرانس جینڈر افراد(کے حقوق کے تحفظ کا) ایکٹ ۲۰۱۸ء

-**سی این آئی سی** (CNIC) کا مطلب ہے کمپیوٹرائزڈ قومی شناختی کارڈ۔

- **شکایت کنندہ** سے مراد وہ ٹرانس جینڈر فرد ہے جس نے ہراساں کیے جانے کے خلاف شکایت درج کرائی ہو۔

- **سی آر سی**(CRC)(چائلڈ رجسٹریشن سرٹیفکیٹ) کا مطلب ہے بچے کا رجسٹریشن سرٹیفکیٹ یا 'ب' فارم۔

جنسی/صنفی اظہار سے مراد ہے کسی شخص کا اپنی جنسی/صنفی شناخت جو وہ اپنے لیے خود محسوس کرتا ہے یا اُس شناخت کا اظہار کرنا جو معاشرہ اُس فرد کو دیتا ہے۔

جنسی/صنفی شناخت کا مطلب ہے کسی شخص کا داخلی اور ذاتی احساس کہ وہ مرد ہے یا عورت ہے، یا دونوں کا مجموعہ ہے یا ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ اس جنسی/صنفی شناخت کے مطابق بھی ہوسکتا ہے اور اس سے مختلف بھی جو اسے پیدائش کے وقت دی گئی تھی۔

حکومت سے مراد پاکستان کی وفاقی حکومت ہے۔

ہراساں کرنا۔ ہراسمنٹ سے مراد جنسی، جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی طور پر ہراساں کرنا ہے جس میں کسی بھی قسم کا جارحانہ دباؤ، دھمکی، بغیر رضامندی جنسی حرکات، زبانی یا تحریری طور پر جنسی تعلقات کے لیے درخواست کرنا، یا ایسا کوئی بھی رویہ اختیار کرنا یا مداخلت کرنا یا اس کا سبب بننا جس سے ٹرانس جینڈر فرد کا طرز زندگی، نقل وحرکت، کام کی کارکردگی اور ماحول خراب ہو۔ ہراساں کیے جانے کے خلاف درخواست دینے یا اس کی پیروی کرنے سے روکنا اور اس پر تشدد کی دھمکی دینا بھی ہراسمنٹ میں شامل ہے۔

نادرا کا مطلب نیشنل ڈیٹا بیس رجسٹریشن اتھارٹی ہے۔

نوٹیفکیشن کا مطلب ہے وہ نوٹیفکیشن جو سرکاری گزٹ میں شامل ہو۔

پی ایم ڈی سی (PMDC) کا مطلب ہے پاکستان میڈیکل اینڈ ڈینٹل کونسل جو ۱۹۶۲ء کے آرڈیننس کے تحت بنائی گئی تھی۔

بیان کردہ: اس قانون کے تحت حکومت کی طرف سے مقرر کردہ اصول۔

قواعد وضوابط: وہ تمام قواعد وضوابط جو اس قانون کے تحت بنائے جائیں گے۔

ٹرانس جینڈر سے مراد وہ شخص ہے جو:

انٹر سیکس (کھسرا) وہ فرد ہے جو بیک وقت مردانہ اور زنانہ جینیاتی خصوصیات کا مرکب ہو یا جو مبہم جنسی اعضاء کا حامل ہو۔

Eunuch (یونخ) وہ شخص جو پیدائشی طور پر مرد ہو اور بعد میں تولیدی اعضاء کی آختہ کاری سے گزرے۔

ٹرانس جینڈر مرد، ٹرانس جینڈر عورت، خواجہ سرا یا کوئی بھی شخص جو اپنی جنسی/صنفی شناخت یا جنسی/صنفی اظہار، اُس صنف/جنس اور اس سے جڑی ثقافتی توقعات وسماجی اقدار کے برعکس ظاہر کرتا ہے جو اسے پیدائشی کے وقت دی گئی تھی۔

2۔ کوئی بھی لفظ یا تعبیر جس کی وضاحت اس قانون میں نہیں کی گئی اس کا مطلب وہی ہوگا جو کوڈ آف کریمینل پروسیجر ۱۸۹۸ء یا پاکستان پینل کوڈ ۱۸۶۰ء (ایکٹ XLV ۱۸۶۰ء) میں بیان کیا گیا ہے۔

3۔ ٹرانس جینڈر شخص کی شناخت کو تسلیم کرنا

(1) ایک ٹرانس جینڈر شخص کو اس قانون کی رُو سے اس کی اپنی مرضی سے طے کردہ جنسی/صنفی شناخت کے مطابق تسلیم کیا جائے گا۔

(2) ہر وہ شخص جسے اس قانون کی مندرجہ بالا دفعہ ۳(۱) ٹرانس جینڈر تسلیم کرتی ہو اسے خود کو نادرا اور دوسرے تمام سرکاری محکموں میں اپنی مرضی سے طے کردہ جنسی/صنفی شناخت کے

مطابق رجسٹرڈ کروانے کا حق ہوگا۔

(3) ٹرانس جینڈر شخص کو، جس کی عمر اٹھارہ سال ہو اور وہ پاکستان کا شہری ہو، یہ حق حاصل ہوگا کہ نادرا کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق متعین کردہ جنسی/صنفی شناخت کو نادرا کے آرڈیننس مجریہ ۲۰۰۰ء یا متعلقہ کسی بھی قانون کے تحت شناختی کارڈ، چائلڈ رجسٹریشن سرٹیفکیٹ، ڈرائیونگ لائسنس، تعلیمی اسناد، پاسپورٹ اور ڈومیسائل وغیرہ پر رجسٹرڈ کروائے۔

(4) ٹرانس جینڈر شخص جس نے پہلے ہی نادرا سے کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈ حاصل کر رکھا ہو اس کو نادرا آرڈیننس مجریہ ۲۰۰۰ء کے تحت اجازت ہوگی کہ وہ اپنے نام اور جنس/صِنف کو شناختی کارڈ، چائلڈ رجسٹریشن سرٹیفکیٹ، ڈرائیونگ لائسنس، تعلیمی اسناد، پاسپورٹ اور ڈومیسائل پر اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کروائے۔

4۔ امتیازی برتاؤ کی ممانعت

کوئی فرد کسی ٹرانس جینڈر شخص سے مندرجہ ذیل امور میں کسی بھی بنیاد پر امتیاز نہیں برت سکتا۔

(a) تعلیمی اداروں اور ان میں ملنے والی تمام خدمات سے انکار، یا عدم استمرار یا غیر منصفانہ رویہ۔

(b) روزگار، پیشے یا تجارت سے متعلق غیر منصفانہ برتاؤ۔

(c) روزگار یا پیشہ دینے سے انکار یا اس کا خاتمہ

(d) علاج یا صحت کے متعلق سہولیات دینے سے انکار، عدم استمرار یا غیر منصفانہ برتاؤ

(e) ہر وہ سہولت جو عوام الناس کے لیے ہو مثال کے طور پر اشیاء خورد ونوش، رہائش، ہر قسم کی خدمات، سہولیات، فائدے استحقاق یا مواقع۔ ان سب کی فراہمی تک رسائی یا استعمال سے انکار یا عدم استمرار یا ان میں نامناسب رویہ اختیار کرنا۔

(f) نقل وحرکت کی سہولت، محفوظ سفر اور نقل وحرکت کے لیے میسر عوامی سہولیات کے استعمال سے انکار، عدم استمرار یا غیر مناسب رویہ۔

(g) رہائش کے حق، کرایہ پر رہائش یا قبضہ ذاتی مکان، خرید و فروخت، وراثتی اور منقولہ

وغیر منقولہ جائیداد کی ملکیت کے حصول میں کسی بھی قسم کا غیر مناسب رویہ، انکار یا عدم استمرار

(h) کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری عہدے کے امیدوار بننے اور اسے حاصل کرنے میں رکاوٹ، عدم استمرار یا غیر منصفانہ رویہ۔

(i) سرکاری ونجی اداروں، تنظیموں، محکموں، مراکز میں ٹرانس جینڈر افراد کو ملازمت نہ دینا یا انہیں برخواست کرنا یا ان سے ناانصافی پر مبنی سلوک کرنا۔

5۔ ہراساں کرنے کی ممانعت

کسی ٹرانس جینڈر فرد کو اس کی جنسی/صنفی شناخت یا اظہار کی وجہ سے ہراساں کرنا، جیسا کہ اس قانون میں وضاحت کی گئی ہے، ممنوع ہے۔

باب چہارم: حکومتی ذمہ داریاں

6۔ حکومتی ذمہ داریاں

حکومت ٹرانس جینڈر افراد کی معاشرے میں محفوظ اور مؤثر شراکت کے لیے اقدامات کرے گی جیسا کہ:

(a) ٹرانس جینڈر افراد کے لیے حفاظتی مراکز (Protection Centers) اور محفوظ گھروں (Safe Houses) کا قیام جہاں ان کے بچاؤ، تحفظ اور بحالی کو یقینی بنایا جائے اور ان مراکز میں ان کے لیے صحت کی سہولیات، نفسیاتی دیکھ بھال و مشاورت اور تعلیم بالغان کی فراہمی۔

(b) کسی بھی قسم کے جرم یا جرائم میں ملوث ٹرانس جینڈر افراد کے لیے علیحدہ جیلوں اور قید خانوں کا قیام۔

(c) ٹرانس جینڈر افراد کے تحفظ اور ریلیف کے لیے سرکاری ملازمین خصوصاً قانون نافذ کرنے والے اداروں اور ہسپتالوں کے عملے کی آگاہی اور تربیت کے لیے وقتاً فوقتاً اقدامات کرتے رہنا۔

(d) ٹرانس جینڈر افراد کے روزگار اور ان کی معاشی حالت کو بہتر بنانے، فروغ دینے اور اچھے مواقع پیدا کرنے کے لیے ان کی پیشہ ورانہ وفنی تربیت کے پروگرام تشکیل دینا۔

(e) چھوٹے کاروبار شروع کرنے کے لیے ٹرانس جینڈر افراد کی حوصلہ افزائی کرنا اور اس کے لیے انہیں امداد، مراعات اور آسان قرضے دینا۔

(f) اس قانون کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے دوسرے ضروری اقدامات کرنا۔

7۔حق وراثت

(1) قانون وراثت کے تحت ٹرانس جینڈر افراد کا جو حق وراثت بنتا ہے، اس کے حصول میں ان سے دوسروں سے کوئی الگ امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔

(2) پاکستانی قانون وراثت کے مطابق ایک ٹرانس جینڈر فرد کو اسی جنس/صِنف کے مطابق حق ملے گا جو اس کے قومی شناختی کارڈ میں درج ہے۔

(3) ٹرانس جینڈر افراد کے لیے وراثت کا حصہ مندرجہ ذیل ہوگا:

i۔ ٹرانس جینڈر مرد کے لیے، وراثت کا حصہ عام مرد جیسا ہوگا۔

ii۔ٹرانس جینڈر عورت کے لیے وراثت میں حصہ عام عورتوں جیسا ہوگا۔

iii۔ ان ٹرانس جینڈر افراد کے لیے جو مرد اور عورت دونوں یا مبہم خصوصیات کے حامل ہوں اور جن کی جنس کا تعین بوقت پیدائش مشکل ہو، ان کے لیے مندرجہ ذیل قانون ہوگا:

(a)18 سال کی عمر ہونے پر، کوئی ٹرانس جینڈر فرد اپنی جنسی/صنفی شناخت اپنی مرضی سے بطور مرد متعین کرتا ہے تو میراث میں اس کا حصہ مرد کے حصے کے برابر ہوگا۔

(b)18 سال کی عمر ہونے پر، اگر ٹرانس جینڈر فرد کی ذاتی طور پر متعین کردہ (Self-Perceived) جنسی/صنفی شناخت عورت کی ہے تو اس کا وراثت کا حصہ عورت جیسا ہوگا۔

(c)18 سال کی عمر ہونے پر، اگر ٹرانس جینڈر فرد خود کو جنسی/صنفی طور پر نہیں سمجھ سکتا کہ وہ ٹرانس جینڈر مرد ہے یا ٹرانس جینڈر عورت۔ تو اس کا وراثتی حصہ مرد اور عورت کی وراثت کے اوسط کے برابر ہوگا۔

(d)18 سال کم عمر ٹرانس جینڈر فرد کی جنس/صِنف کا تعین میڈیکل آفیسر مرد یا عورت کی

نمایاں خصوصیات کی بنیاد پر کرے گا۔

8۔حقِ تعلیم

(1) کسی بھی سرکاری یا نجی تعلیمی ادارے میں داخلہ لینے کے لیے مقرر کردہ معیار کو پورا کرنے کے علاوہ ٹرانس جینڈر افراد کے خلاف کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔

(2) تمام تعلیمی اداروں میں ٹرانس جینڈر افراد کو کسی بھی امتیاز کے بغیر اور مساوات کی بنیاد پر تعلیم، کھیل اور تفریحی سرگرمیوں کے مواقع فراہم کیے جائیں گے۔

(3) حکومت ٹرانس جینڈر افراد کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرنے کے لیے اقدامات کرے گی جیسا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کے آرٹیکل 25A کے تحت ضمانت دی گئی ہے۔

(4) کوئی سرکاری یا نجی تعلیمی ادارہ کسی بھی ٹرانس جینڈر فرد کے خلاف اس کی جنس، جنسی /صنفی شناخت یا جنسی/صنفی اظہار کی بنیاد پر امتیازی سلوک روا نہیں رکھے گا، خصوصاً

(a) یہ تعین کرنے میں کہ کس کو حق داخلہ حاصل ہے۔

(b) داخلے کی شرائط وضوابط کے تعین میں

(c) کسی بھی فرد کی تعلیم منسلک تربیتی مواقع تک رسائی کو محدود یا مسترد کرنا۔

(d) کسی طالب علم کی جنس و جنسی/صنفی شناخت یا اظہار کی بنیاد پر مناسب سہولیات تک رسائی سے انکار کرنا۔

۹۔ روزگار کا حق

(1) ٹرانس جینڈر افراد کے لیے کسی بھی قانونی ذریعہ معاش یا پیشہ میں شامل ہونے یا تجارت وکاروبار کو منظم کرنے کے حق کو حکومت یقینی بنائے گی جیسا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین ۱۹۷۳ء کے آرٹیکل ۱۸ کے تحت ضمانت دی گئی ہے۔

(2) کوئی بھی ادارہ، محکمہ، تنظیم، کسی بھی جگہ پر کسی بھی ٹرانس جینڈر کے خلاف امتیازی سلوک روا نہیں رکھے گا بشمول تمام متعلقہ مسائل جیسے کہ ترقی، بھرتی، ٹرانسفر وغیرہ میں۔

(3) کسی آجر کے لیے کسی ملازم کے ساتھ اس کی جنس، جنسی/صنفی شناخت یا جنسی/صنفی

اظہار کی بنا پر تعصب وغیرہ مناسب رویہ رکھنا غیر قانونی ہوگا، خصوصاً

(a) اس بات کا تعین کرنے میں کہ حق ملازمت کس کو حاصل ہے

(b) کن شرائط وضوابط کی بنیاد پر روزگار کی پیشکش کی جارہی ہے۔

(c) ترقی، ٹرانسفر، ٹریننگ کے مواقع اور تمام وہ فوائد جو ملازمت سے منسلک ہوں ان تک ملازم کی رسائی کو محدود یا مسترد کرنا

(d) ملازم کو برطرف کرنا

(e) ملازم کو کسی دوسرے طریقے سے نقصان پہنچانا۔

10۔ ووٹ دینے کا حق

کسی بھی شخص کو قومی، صوبائی اور مقامی حکومتوں کے انتخابات کے دوران ووٹ ڈالنے کے حق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ نیز شناختی کارڈ پر لکھی ہوئی جنس/صِنف کے مطابق ٹرانس جینڈر افراد کو متعلقہ پولنگ اسٹیشنوں تک رسائی فراہم کی جائے گی۔

کسی بھی شخص کو قومی، صوبائی اور مقامی حکومتوں کے انتخابات کے دوران ووٹ ڈالنے کے حق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ نیز شناختی کارڈ پر لکھی ہوئی جنس/صِنف کے مطابق ٹرانس جینڈر افراد کو متعلقہ پولنگ اسٹیشنوں تک رسائی فراہم کی جائے گی۔

11۔ سرکاری عہدوں پر تعیناتی کا حق

کوئی ٹرانس جینڈر فرد الیکشن میں حصہ لینا چاہتا ہو اور پبلک آفس ہولڈ کرنا چاہتا ہو تو جنسی/صِنفی شناخت یا جنسی/صِنفی اظہار کی بنیاد پر اس سے امتیازی برتاؤ نہیں کیا جائے گا۔

12۔ صحت کا حق

حکومت ٹرانس جینڈر افراد کے لیے بلا امتیاز صحت کے معاملات کو یقینی بنانے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کرے گی:

(a) ٹرانس جینڈر افراد کے مخصوص صحت کے مسائل حل کرنے کے لیے، ڈاکٹروں اور نرسنگ کے عملے کے لیے بہتر تحقیق اور طبی نصاب کا جائزہ لیا جائے گا۔ یہ کام حکومت پی ایم ڈی سی

کے تعاون سے کرے گی۔

(b) ہسپتالوں اور صحت کی دیکھ بھال کے دیگر مراکز تک رسائی کے لیے حکومت ٹرانس جینڈر افراد کے لیے محفوظ ماحول فراہم کرے گی۔

(c) ٹرانس جینڈر افراد کی ضروری طبی، نفسیاتی و جنسی/صنفی اصلاحی علاج تک رسائی یقینی بنائی جائے گی۔

13۔حق اجتماع

(1) حکومت ٹرانس جینڈر افراد کے حق اجتماع کی آزادی کو یقینی بنائے گی جیسا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین ۱۹۷۳ء کے آرٹیکل ۱۶ میں لکھا گیا۔

(2) حکومت ٹرانس جینڈر افراد کے لیے موزوں حفاظتی اقدامات کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کرے گی۔

(3) عوامی مفاد کے لیے لگائی گئی پابندیوں کے علاوہ کسی بھی ٹرانس جینڈر فرد کے ساتھ جنس، جنسی/صنفی شناخت یا جنسی/صنفی اظہار کی بنیاد پر کسی بھی قسم کا امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔

14۔عوامی مقامات پر رسائی کا حق

(1) ٹرانس جینڈر افراد کو عوامی مقامات، تفریحی مقامات اور مذہبی مقاصد کے لیے مختص کی گئی جگہوں پر رسائی کا حق حاصل ہوگا۔ جنسی/صنفی شناخت، جنسی/صنفی اظہار کی بنیاد پر ان کو داخلے سے نہیں روکا جائے گا۔

(2) اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین ۱۹۷۳ء کے آرٹیکل ۲۶ کے مطابق حکومت عوامی مقامات تک ٹرانس جینڈر افراد کی رسائی یقینی بنائے گی۔

(3) مذکورہ بالا سیکشن (1) میں بیان کردہ عام عوامی مقامات تک رسائی کے لیے دستیاب سہولیات تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ٹرانس جینڈر کو روکنا غیر قانونی ہوگا۔

15۔جائیداد کا حق

(1) کسی ٹرانس جینڈر فرد کو جائیداد کی خرید وفروخت گھر یا سامان کرائے پر لینے دینے یا کرایہ دار ہونے کے حق سے اس کی جنس،جنسی/صنفی شناخت یا جنسی/صنفی اظہار کی بنیاد پر انکار نہیں کیا جائے گا۔

(2) کسی ٹرانس جینڈر شخص کو اس کی جنس،جنسی/ صنفی شناخت یا جنسی/صنفی اظہار کی بنیاد پر جائیداد یا مکان کرائے پر لینے یا دینے سے انکار کرنا یا رکاوٹ پیدا کرنا غیر قانونی ہوگا۔

16۔بنیادی حقوق کی ضمانت

(1) اس باب میں ذکر کردہ حقوق کے علاوہ،اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین ۱۹۷۳ء کے باب (I) حصہ (II) میں ذکر کردہ تمام بنیادی حقوق ہر ٹرانس جینڈر فرد کو میسر ہوں گے۔

(2) یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ اوپر ذکر کردہ سیکشن (1) میں مذکور تمام بنیادی حقوق ٹرانس جینڈر افراد کو ملیں گے اور جنسی/صنفی شناخت یا جنسی/صنفی اظہار کی بنیاد پر کوئی امتیازی سلوک ان سے روا نہیں رکھا جائے گا۔

17۔جرائم اور سزا

جو شخص کسی ٹرانس جینڈر کو بھیک مانگنے کے لیے استعمال کرے گا یا اس مقصد کے لیے ملازم رکھے گا اسے چھ ماہ تک کی قید ہوسکتی ہے،بچاس ہزار روپے تک جرمانہ ہوسکتا ہے یا دونوں سزائیں اکٹھی بھی دی جاسکتی ہیں۔

باب ششم: لائحہ عمل برائے نفاذ

18۔نفاذ کا لائحہ عمل

آئین پاکستان پینل کوڈ ۱۸۶۰،کوڈ آف کریمینل پروسیجر ۱۸۹۸ء اور کوڈ آف سول پروسیجر ۱۹۰۸ء میں دی گئی قانونی سہولتوں کے ساتھ اگر کسی ٹرانس جینڈر فرد کے ان حقوق کی خلاف ورزی کی جائے،جن کی ضمانت یہ قانون دیتا ہے تو اسے یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اس کے خلاف وفاقی محتسب ،قومی کمیشن برائے حقوق نسواں،قومی کمیشن برائے انسانی حقوق (NCHR) کے اداروں میں شکایت کرے: (بقیہ صفحہ نمبر:۵۰)

فقہ وقانون

شعیب مدنی

پاکستان میں نئے باطل نظریہ جنس

LGBT کے 23 واقعات اور ثبوت

بہت سے لوگ سمجھ رہے ہیں کہ ٹرانس جینڈر کا مسئلہ شاید خنثیٰ یا انٹرسیکس یعنی جو پیدائشی جنسی نقص کا شکار ہوتے ہیں، ان کے حقوق کا مسئلہ ہے۔نہیں! ایسا نہیں ہے۔ یہ قانون سازی ان بیچاروں کے حقوق کے لیے نہیں ہے۔ہم سب بھی اس محروم طبقے کے ساتھ ہیں لیکن اصل میں ان کا نام استعمال کر کے لادینیت کی جنگ ہم پر مسلط کی جا چکی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اپنی امت کے بارے میں سب سے زیادہ خوف اس بات کا ہے کہ وہ قومِ لوط والا عمل شروع کر دے گی۔

کسی بھی معاشرے میں ہم جنس پرستی اور نئے باطل نظریہ جنس یعنی ایل جی بی ٹی کی ابتدا ٹرانس جینڈر سے کی جاتی ہے۔سمجھ لیں کہ خاندانی نظام کے خول کو توڑنے کے لیے ٹرانس جینڈر کی ''ٹی'' ایک ہتھوڑا ہے۔جس معاشرے نے اسے قبول کر لیا پھر وہ لیسبین، گے، بائی سکشول اور کوئیر سے بھی بچ نہیں سکتا۔ جو پہلے جنسی جرائم تھے وہ اب آزادی، مساوات اور ترقی کے نام پر ہیومن رائٹس میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔ہم جنس پرستی کو ہمیشہ سے ہی برا سمجھا جاتا رہا ہے لیکن اب اسے انگریزی میں Pride اور Dignity یعنی فخر اور وقار کہا جا رہا ہے اور ان مجرموں کو سزا کی بجائے برابری کے حقوق دینے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔گویا ایک گناہ کبیرہ کو اچھائی میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔یعنی اللہ کے حرام کو حلال کیا جا رہا ہے اور یہ یقیناً کفر ہے۔

پاکستان میں جنسی آزادی کی خاطر سرکاری اور قانونی طور جو کچھ کیا جا رہا ہے۔اس سیلاب کو اگر آج نہ روکا گیا تو باطل نظریات ہماری آنے والی نسلوں کو لادینیت کی گہری کھائی میں جھونک دیں گے۔

میں آپ کو 23 ایسے واقعات اور ثبوت پیش کرنے جا رہا ہوں جنہیں دیکھنے کے بعد آپ کو اس تہذیبی جنگ کی سنگینی کا اندازہ ہو سکے گا۔ کہ جنسی آزادی کا نظریہ ہمارے خاندانی نظام کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

1۔ وومن اسٹڈیز(Women Studies)

1989ء سے مغربی نظام تعلیم ، مذہب سے دوری اور مالی مفادات کی خاطر پاکستان میں فیمن ازم یعنی حقوق نسواں کی تحریک کو ہماری یونیورسٹیز میں وومن اسٹڈیز کے نام سے متعارف کروایا جانے لگا۔ یہ تھیں وہ مائنز جو آج آپ کے پاکیزہ معاشرے میں جنسی آزادی اور برابری کے مطالبات کو شہری خواتین میں عام کر چکی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے خاندانی نظام میں مرد کو ایک درجہ فضیلت دی ہے۔اور اسے خاندان کا سربراہ متعین کیا ہے۔ وومن اسٹڈیز اللہ کے بنائے نظام سے بغاوت کے لیے افراد تیار کرتا ہے۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن کے کریکلم کے اہداف میں واضح لکھا ہے کہ:

وومن اسٹڈیز کا مقصد اس بات کا تجزیہ کرنا ہے کہ جنس سماجی رویوں سے بنتی ہے اور اس نظریے کو بنیاد بنا کر معاشرے سے جنسی عدم مساوات اور مرد کے ماتحت خاندانی نظام کو توڑنا ہے۔

سیکس اور جینڈر کو الگ الگ معنیٰ پہنانا اور جینڈر کو سوشل کنسٹرکٹ قرار دینا ہی نئے باطل جنسی آزادی کے نظریے کی بنیاد ہے۔ٹرانس جینڈر اور LGBT نظریات اسی سیکس اور جینڈر کو ایک دوسرے کا مستلزم نہ قرار دے کر ہی وجود پاتے ہیں۔(ہائیر ایجوکیشن کمیشن آف پاکستان کا وومن اسٹڈیز کا مکمل نصاب)۔

2۔ اسلام آباد میں امریکی سفارت خانہ کا ہم جنس پرستوں کے جلسے کا انعقاد

26جون 2011ءکو اسلام آباد کے امریکی سفارت خانہ نے ہم جنس پرستوں یعنی LGBTQ کمیونٹی کے تحفظ اور حقوق کے نام پر GAY Pride ایونٹ کا انعقاد کیا۔ اندرونِ خانہ یہ کاروائیاں تو نجانے کب سے شروع ہو چکی ہوں گی لیکن یہ ایونٹ امریکہ کی جانب سے پاکستان میں ایل جی بی ٹی یعنی ہم جنس پرستی کے نظریے کے نفاذ کا اعلان سمجھا جا سکتا ہے۔ اس ایونٹ کے خلاف اسلامی جماعتوں نے احتجاج مظاہرے بھی کئے۔جس کے بعد واشنگٹن ڈی سی میں پریس بریفنگ کے دوران ایک سوال ہوا۔

''کیا امریکی سفارت خانے میں ہونے والے ہم جنس پرست مردوں کے ایونٹ ''گے پرائڈ'' کے انعقاد پر پاکستانی حکومت کی جانب سے کوئی احتجاج ہوا ہے؟ اور اس ایوینٹ کی نیچر کیا تھی؟

امریکی اسپوکس پرسن نے جواب دیتے ہوئے کہا:

''26 جون کو اسلام آباد میں امریکی سفارت خانہ نے ہم جنس پرست مردوں یعنی گیز، ہم جنس پرست عورتوں یعنی لیسبینز، بائی سیکشوئل اور ٹرانس جینڈر افراد پر مشتمل ایک جی ایل بی ٹی پرائڈ کا ایونٹ منعقد کیا۔ اس پرائڈ ایونٹ میں سفارت خانہ کے افراد، پاکستانی سفارت کار اور سول سوسائٹی کے اراکین شامل ہوئے اور ہیومن رائٹس کے ساتھ ساتھ ایل جی بی ٹی رائٹس کی بھرپور حمایت کی۔ اس پروگرام کے انعقاد پر ہمیں پاکستانی حکومت کی جانب سے کوئی شکایت موصول نہیں ہوئی۔

یاد رہے اس وقت پیپلز پارٹی کی حکومت تھی۔ آصف زرداری صدر تھے جبکہ یوسف رضا گیلانی وزیراعظم۔

3۔ جینڈر راسٹڈیز (Gender Studies) اور اسے نافذ کرنے کے لیے امریکہ کی امداد

2017ء میں ہائیر ایجوکیشن کمیشن نے پاکستان میں جینڈر راسٹڈیز کو متعارف کروایا۔ اور وومن اسٹڈیز کو جینڈر راسٹڈیز کے تحت لے لیا گیا۔ جینڈر راسٹڈیز کے نصاب کے مقاصد میں واضح طور پر لکھا ہے کہ:

21 ویں صدی کی ضرویات کو پورا کرنے کے لیے وومن اسٹڈیز کو جینڈر راسٹڈیز میں تبدیل کیا جارہا ہے کیونکہ ویمنز اسٹڈیز کی توجہ خواتین اور حقوق نسواں پر زیادہ تھی جبکہ جینڈر راسٹڈیز کے زیادہ جامع ہونے کی وجہ سے تمام جنسیات سے متعلق مسائل اس میں شامل ہیں، جیسے ہم جنس پرست لسبین، گے، بائی سکشول، ٹرانس جینڈر، انٹرسیکس اور کوئیر (LGBTQ)۔ ہائیر ایجوکیشن کمیشن آف پاکستان کا جینڈر راسٹڈیز کا مکمل نصاب دیکھا جاسکتا ہے۔

اب آپ پوچھیں گے کہ پاکستان میں ایسا کورس کیوں پڑھایا جا رہا ہے؟ تو صرف ایک ثبوت جلدی سے دیکھ لیں۔

یہ 23 دسمبر 2020ء کی ایک خبر ہے جس میں واضح طور پر بتایا گیا کہ امریکہ کی جانب سے پاکستان کو جمہوریت اور جینڈر راسٹڈیز کے فروغ کے لیے 25 ملین ڈالر کی امداد دی گئی ہے۔ یہ تو صرف ایک ثبوت ہے۔

اب میرا سوال یہ ہے کہ فیمن ازم، نئے باطل نظریہ جنس اور ایل جی بی ٹی کے نظریات پر بی ایس اور ایم ایس کرنے کے بعد ہمارے نوجوان کس چیز کی معاشرے میں advocacy یعنی وکالت کریں گے؟ یہ کام بہت ہی خطرناک ہو رہا ہے۔ چند سالوں میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں جب خود پاکستانی مسلمان اس باطل نظریے کے قائل اور وکیل بن جائیں گے تو پھر ہم اس بے راہ روی کو کیسے روک سکیں گے؟

4۔ کیپٹل ایڈمنسٹریشن اینڈ ڈویلپمنٹ اسلام آباد کی جانب سے خواجہ سراؤں کے حقوق اور تحفظ کا بل۔

2015 ۔2016ء سے کوشش جاری تھی کہ خواجہ سراؤں کے حقوق کے نام پر کسی طرح جنسی آزادی کے نظریات کو پاکستانی قوانین میں گنجائش دی جائے۔

5۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی سالانہ رپورٹ 2015۔2016ء

2015۔2016ء میں اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنی رپورٹ پیش کی اور صاف لکھ دیا کہ پاکستان کو اس طرح کے قانون کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔(اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ برائے 2015۔2016ء)

6۔ **نادرا** نے اپیلی کیشن فار نیشنل آئیڈینٹی کارڈ امینڈمنٹ ریگولیشن 2017ء کے ذریعے تیسری جنس Non-Binary کو پاکستان میں داخل کرنے کی سازش کی۔اس میں اس نے میل فیمل کے علاوہ x جینڈر کو شامل کر لیا۔اب اس میں تین شناختی مارک اور پانچ جنسیں داخل کر دی گئیں:1 میل 2M۔2 فی میل 3F۔میل یونخ 4X۔فی میل یونخ 5X۔یونی سیکس X۔

آپ کو میں نے اپنی ویڈیو''ثبوت حاضر ہیں''میں یوگیا کارتا کے بارے میں بتایا تھا۔ یوگیا کارتا ہم جنسی پرستی (LGBT) کو کسی بھی ملک میں داخل کرنے کے لیے سب سے پہلے تھرڈ جینڈر یعنی تیسری جنس قبول کرواتے ہیں۔کیوں کہ اللہ نے صرف دو جنس بنائی ہیں۔اسے یہ لوگ بائنری کہتے ہیں۔اور اب یہ مزید جتنی بھی جنسی شناخت لاتے ہیں اسے نان بائنری کہتے ہیں۔ جیسے +LGBTQIA یہ حروف بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ یہ ہے LGBT کا پہلا دروازہ جو 2017ء میں کھول دیا گیا تھا۔

7۔ قومی اسمبلی میں پرائیوٹ ممبر کی جانب سے ٹرانس جینڈر بل پیش کیا گیا۔

2017ء میں قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کی ایک رکن نے ٹرانس جینڈر بل پیش کیا۔ جسے فورا منظور کر کے سینٹ بھیجا دیا گیا۔لیکن سینیٹ میں اس پر کمیٹی بنائی گئی۔

8۔ نئے نظریہ جنس ایل جی بی ٹی نظریات پر مبنی ایک نیا ٹرانس جینڈر بل اور اردو ترجمہ سے متنازعہ تعریف حذف کرنے کی سازش۔ 2018ء میں پیپلز پارٹی ایک بالکل نیا ڈرافٹ لے آئی اور اسے اس بل میں ترمیمات کے طور پر شامل کر کے جلدی سے پاس کروا کر دوبارہ قومی اسمبلی بھیج دیا۔ یہاں تک کہ اسے اسلامی نظریاتی کونسل تک کو نہیں دکھایا۔ یہ سارا کام بڑی چالاکی سے ہوا۔

صرف ایک سازش آپ کے سامنے لاتے ہیں۔ سینیٹ یا اسمبلی میں جب کوئی بل پیش ہوتا ہے تو اس کا اردو ترجمہ بھی ساتھ دیا جاتا ہے تاکہ جو انگلش نہیں جانتے وہ اردو میں پڑھ لیں۔

یہ ہے وہ ترجمہ جو سینیٹ میں پیش کیا گیا اس میں اس وقت موجود انگلش بل میں موجود متنازعہ ٹرانس جینڈر کی تعریف لکھی گئی تھی۔ وہ اُردو ترجمے میں موجود ہی نہیں تھی۔

9۔ متنازعہ ٹرانس جینڈر بل کی مخالفت لیکن کوئی شنوائی نہیں۔ بل میں موجود لفظ خنثیٰ کو ایکٹ میں کھسرا سے تبدیل کرنے کی سازش۔

2018ء قومی اسمبلی کے آخری سیشن میں پیپلز پارٹی نے ٹرانس جینڈر بل پیش کیا۔ اس پر نعیمہ کشور صاحبہ جن کا تعلق جمعیت علماء اسلام سے ہے، انھوں نے اعتراض کیا اور بل کو کمیٹی یا اسلامی نظریاتی کونسل کو بھیجنے کی درخواست کی لیکن پیپلز پارٹی کے نوید قمر صاحب نے اور مسلم لیگ ن کے اسپیکر ایاز صادق نے ان کی کوئی بات نہیں سنی اور باقی تمام جماعتوں مسلم لیگ ق، ایم کیو ایم اور پی ٹی آئی کی حمایت سے بل پاس کر دیا۔

اب وہاں بھی ایک چالاکی دیکھیں۔ جو بل کی کاپی قومی اسمبلی میں دی گئی اس میں سیکشن 2 سب سیکشن (این) کی کلاز (i) میں انٹرسیکس کے ساتھ خنثیٰ لکھا تھا۔ لیکن جب ایکٹ شائع کیا گیا تو وہاں کھسرا لکھ دیا گیا۔ جس سے اس پورے معاملے کی بددیانتی واضح ہو جاتی ہے۔

10۔ ٹرانس جینڈر ایکٹ 2018 کا پاکستان میں نفاذ

2018ء میں اس قانون کو پورے پاکستان میں نافذ کر دیا گیا۔ اس لیے ان غلط فہمیوں

سے باہر آ جائیں کہ یہ ابھی تک پاس نہیں ہوا۔(ٹرانس جینڈر ایکٹ 2018ء کی گزیٹڈ کاپی)۔

11۔اقوام متحدہ، IMF،GSP +،اور یورپین کمیشن کے معاہدے کے مطابق پاکستان نے ٹرانس جینڈر ایکٹ بنایا ہے اور جنس اختیار کرنے کی کھلی اجازت دی ہے۔

ٹرانس جینڈر ایکٹ 2018ء میں سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ کوئی بھی شخص اپنی پیدائشی جنس سے انحراف کر کے اپنی مرضی کی کوئی بھی دوسری جنس اختیار کر سکتا ہے۔اسے قانون میں Self-Perceived Gender Identity لکھا گیا ہے۔اس وقت میڈیا پر عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے جھوٹ بولا جا رہا ہے کہ یہ صرف پیدائشی خنثیٰ (جسے عام لوگ خواجہ سرا) کہہ دیتے ہیں ان کے لیے ہے اور انھیں صرف x شناخت ہی ملتی ہے۔اگر ایسا مان لیا جائے تو پھر self-perceived کا کیا مطلب ہے؟

یورپین کمیشن نے GSP+اسسمنٹ رپورٹ برائے 2018-2019ء جاری کی اور اپنی رپورٹ میں بتایا کہ پاکستان نے GSP+ کی سہولت کے بدلے ہمارے مطالبات مانتے ہوئے نہ صرف ٹرانس جینڈر ایکٹ 2018ء پاس کیا بلکہ اس میں اپنی مرضی سے جنس تبدیل کرنے کا حق بھی دیا۔یاد رہے کہ یورپی یونین پوری دنیا میں ہم جنس پرستی ایل جی بی ٹی کیو پلس کو قانونی حیثیت دلوانا چاہتی ہے۔

12۔پی ٹی آئی کی حکومت نے ٹرانس جینڈر ایکٹ کی سر پرستی کی اور اُسے اپنا کارنامہ قرار دیا۔

2018ء ہی میں پی ٹی آئی کی حکومت نے اس ناپاک سازش کو اون کیا۔خود سن لیں۔(شیریں مزاری کی کلپ)

13۔ٹرانس جینڈر رولز 2020ء کا نفاذ

2020ء میں پی ٹی آئی کی حکومت نے ٹرانس جینڈر رولز نافذ کر دیئے۔ان رولز میں نہ صرف ٹرانس جینڈرز کو سرجری کی اجازت دے دی گئی بلکہ انھیں غیر مشروط طور پر امریکی ادارے WPATH کے جاری کردہ طریقہ کار کا پابند بھی بنا دیا گیا ہے۔اور ایسا دروازہ کھول دیا گیا ہے کہ وہاں جو بھی تبدیلیاں ہوتی رہیں گی پاکستانی قوانین اس کے پابند ہوتے جائیں گے۔

14۔ہم جنس شادی کا کیس لاہور ہائی کورٹ میں

2020ء لاہور ہائی کورٹ کے راولپنڈی بنچ میں رٹ پٹیشن 1421-2020 دائر کی گئی۔ اس میں ایک شخص نے اپنی بیٹی کی ہم جنس شادی کے خلاف کیس دائر کیا تھا۔ کیونکہ ایک خاتون نے اسی ٹرانس جینڈر ایکٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی جنسی شناخت تبدیل کروا کر اس شخص کی بیٹی سے نکاح کر لیا تھا۔

15۔ ٹرانس جینڈر بطور فی میل لیکچرار مقرر کرنے کا فیصلہ پٹیشن 3176-2021

2021ء لاہور ہائی کورٹ میں ایک ٹرانس جینڈر نے رٹ پٹیشن 3176-2021 دائر کی۔ پاکستان پبلک سروس کمیشن نے 2020ء میں میل فیمیل لیکچرار کی نوکریوں کے لیے ایک اشتہار دیا تھا۔ اس ٹرانس جینڈر نے فیمیل لیکچرار کی جاب کے لیے اپلائی کیا لیکن اسے ٹرانس جینڈر ہونے کی وجہ سے رجیکٹ کر دیا گیا۔ ٹرانس جینڈر کا دعوی تھا کہ وہ ٹرانس وومن ہے اس لیے اسے فیمیل لکچرار کی جاب دی جائے، اور اسی ٹرانس جینڈر ایکٹ 2018ء کے حوالے سے اس نے اپنا حق مانگا اور فیصلہ اس کے حق میں دے دیا گیا۔ اب پبلک سروس کمیشن آف پاکستان کے اشتہارات میں باقاعدہ میل، فی میل کے ساتھ ٹرانس جینڈر بھی لکھا جا رہا ہے۔

16۔ ٹرانس جینڈرز فی میل بن کر کالجز میں پڑھا رہے ہیں

خواتین کے کالجز میں مرد اپنی جنس شناخت بدل کر نوکریاں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کی مثال عثمان مغل ہیں۔ یہ پہلے ایک مرد تھے اور ایک یونیورسٹی میں جینڈر اسٹڈیز کے لیکچرار تھے۔ پھر انھوں نے اپنی شناخت ٹرانس جینڈر سے تبدیل کرالی اور اب یہ عائشہ مغل ہیں اور طلبہ کو عورت کے روپ میں پڑھاتے ہیں۔ یہ ٹرانس جینڈر ایکٹ کے دفاع میں این جی اوز کے ساتھ کام کرتے ہیں۔

17۔ ترمیم برائے پاکستان پینل کوڈ 1860 سیکشن 509

2022ء میں پی پی پی نے قومی اسمبلی میں پی پی سی 509 ترمیمی بل جمع کرایا ہے جس میں عورت کے ساتھ ٹرانس جینڈر کو شامل کرنے کی ترمیم پیش کی۔ اور ٹرانس جینڈر کو بھی عورت کی طرح تحفظ اور پرائیویسی تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا ہے تاکہ ان کے میڈیکل ایگزامینیشن کے مطالبے کو رد کیا جا سکے۔ گویا کہ اسے بھی حقیقی عورت کی طرح قبول کیا جائے۔

18۔ٹرانس جینڈر کی قومی اسمبلی میں تقریر

14 اگست 2022ء کو ایک مغربی این جی اوز کے لیے کام کرنے والے ٹرانس جینڈر سے قومی اسمبلی میں تقریر کروائی گئی۔اور یہ خبریں آ رہی ہیں کہ ٹرانس جینڈر کو اسمبلی میں مخصوص نشست بھی دی جا سکتی ہے۔

19۔ٹرانس جینڈر ویلفیئر انڈومنٹ فنڈ بل 2022ء۔خیبر پختونخواہ اسمبلی

2022ء خیبر پختون خواہ اسمبلی میں پی ٹی آئی حکومت نے ٹرانس جینڈر ویلفیئر انڈومنٹ فنڈ کا بل پیش کیا ہے۔جس میں ٹرانس جینڈر کی اصطلاح کو معاشرے میں normalize کرنے کی غرض سے بجٹ دینے کا مطالبہ ہے۔اس میں صاف لکھا ہے کہ:

1۔ سرکاری افسران اور ملازمین کی تربیت کی جائے گی تا کہ وہ ٹرانس جینڈرز کے معاملات میں حساس ہو جائیں۔

2۔ ورک شاپس، سیمینارز، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سمیت سوشل میڈیا پر بھی ٹرانس جینڈرز کی فلاح و بہبود کے حوالے سے عوامی آگہی کی مہمات چلائی جائیں گی۔

3۔ ٹرانس جینڈرز کی فلاح و بہبود کا مکمل نظام بنانے اور ملک میں نافذ کرنے کے لیے تحقیق کو فروغ دیا جائے گا۔

اقوام متحدہ کے ادارہ برائے تحفظ وفروغ ہم جنس پرستی کی دستاویز ٹرانس جینڈر میں ٹرانس جینڈرازم کو دنیا میں نارملائز کرنے کی حکمت عملی لکھی گئی ہے۔اور افسوس کہ ہماری حکومت ہو بہو ان سفارشات پر عمل کروانا چاہتی ہے۔

اس دستاویز کے ایکشن پوائنٹس میں صاف لکھا ہیں کہ ریاستوں کو پابند کیا جائے گا کہ وہ ان قوانین کو ختم کریں جو ٹرانس جینڈرز کو آزادی دینے کے خلاف ہیں۔اس کے علاوہ میڈیا سے متعلق عملی اقدامات میں ٹرانس جینڈرز کو میڈیا پر ہر قسم کی نمائندگی دی جائے گی۔میڈیا پر ٹرانس جینڈرز کے خلاف کوئی بات کرنے کی اجازت کسی کو نہیں ہوگی۔لوگوں کو پابند کیا جائے گا کہ وہ ٹرانس جینڈرز کے من پسند الفاظ بولیں اور جنسی شناخت کے ساتھ ان کو عزت دیں اور کسی کو ٹرانس جینڈر کی شناخت اُس کی مرضی کے بغیر ظاہر کرنے کی اجازت نہ ہو۔

20۔SECP سکیورٹی ایکسچینج کمیشن آف پاکستان کا ای ایس جی (ESG) پروگرام

2022ء ہی میں SECP نے اقوام متحدہ کے پروگرام SDG سسٹین ایبل ڈویلپمنٹ گولز کے مطابق ESG یعنی اینوائرمینٹل سوشل گورنینس کو لاگو کر دیا ہے۔ SECP کے ای ایس جی ریگولیٹری روڈ میپ میں 2020۔2021ء کے ٹارگٹس میں جینڈر ڈائیورسٹی پالیسی اور جینڈر بانڈ گائڈ لائن کو شامل کیا گیا ہے۔ اقوام متحدہ جینڈر ڈائیورسٹی میں LGBT کو بھی شامل کرتا ہے۔ UNDP کی ویب سائٹ پر واضح طور پر ہم جنس پرستوں یعنی LGBT کمیونٹی کو حقوق دینے کا مطالبہ موجود ہے۔

20 مئی 2021ء کو SECP نے جینڈر بانڈ گائڈ لائنز جاری کیں۔ یہ بھی اقوام متحدہ کے SDGs کے مطابق ہے اور یہ خواتین اور ٹرانس جینڈرز اور دیگر جنسی/صنفی اقلیتوں یعنی LGBT کے حقوق کے تحفظ وفلاح کے لیے جاری کیے جائیں گے۔

21۔سول سروس امینڈمنٹ بل 2022ء سندھ اسمبلی

2022ء ہی میں سندھ سِول سروسز امینڈ مینٹ بل 2022ء پاس کیا گیا جس کے مطابق ٹرانس جینڈرز کو نوکریوں میں 0.5 فیصد کوٹہ دیا جائے گا۔ اگر یہ حقیقی پیدائشی خنثیٰ ہیں تو آخر انھیں ایک الگ مخلوق کیوں بنایا جا رہا ہے؟ یہ لوگ انھیں عام مرد وخواتین میں شامل کیوں نہیں کرتے؟ فقہاء تو ایسے افراد کو ان کے غالب حیاتیاتی اعضاء اور جینیاتی کیفیت کے مطابق مرد یا عورت کسی ایک جنسی شناخت میں شامل کرتے ہیں۔

22۔قومی اسمبلی میں اقوام متحدہ کا SDGs پروگرام کا سیکریٹریٹ

15 ستمبر 2022ء کو قومی اسمبلی میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں SDGs کو پاکستان میں نافذ کرنے کی حکمت عملی کا جائزہ لیا گیا۔

اقوام متحدہ کے اس پروگرام میں بھی ہم جنس پرستوں، LGBT اور ٹرانس جینڈر کو برابر حقوق دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے اور اسے پاکستان میں بھی رائج کیا جا رہا ہے۔

23۔17 مئی 2022ء کو امریکی سفارت خانہ نے کھل کر پاکستان میں LGBT کی حمایت کا اعلان کیا۔

یہ ہیں وہ چند باقاعدہ آفیشل اقدامات جن کے ذریعے پاکستان کے قوانین کو اسلام کے خلاف سیکولرائز کیا جارہاہے۔اسی وجہ سے جب ہم سے رہا نہیں گیا تو ہمیں اس کے خلاف کھڑا ہونا پڑا۔اب یہ امت مسلمہ کا فرض ہے کہ آپ ان تمام باطل کفریہ قوانین کو ختم کروائیں۔یاد رکھیں! اگر ہم نے آج اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی تو قیامت کے دن ہماری بھی پکڑ ہوسکتی ہے۔یہ ایک وقتی مسئلہ نہیں مسلمانوں کو اپنے عقیدے و عمل کی حفاظت کے لیے باقاعدہ ایک جدوجہد کا آغاز کرنا ہوگا۔

میرا آپ سے ایک سوال ہے۔اس کا جواب ذرا سوچ سمجھ کر دیجئے گا۔اور اگر دنیا میں اس کا جواب نہیں دے سکے تو قیامت کے دن اللہ کے سامنے کیسے دیں گے؟ سوال یہ ہے کہ کیا اب بھی آپ انہی ایمان فروش سیاست دانوں کو ووٹ دیتے رہیں گے؟ اور اگر آپ کا جواب ہاں میں ہے،تو اللہ کے سامنے کس منہ سے پیش ہوں گے اور کس منہ سے رسول اللہ ﷺ کی شفاعت طلب کریں گے؟ ویڈیو کے لیے دیکھیے:

(SHAOOR.PK Fb.com/www.shaoor.pk Youtube. shaoorpk)

بقیہ: ٹرانس جینڈر ایکٹ کا اردو ترجمہ

باب ہفتم: متفرق

19۔قانونی حیثیت

یہ قانون اس ضمن میں بنائے گئے دیگر تمام قوانین پر حاوی ہوگا۔

20۔اصول وضوابط بنانے کا اختیار　　21۔ابہام ومشکلات دور کرنے کا اختیار

اگر اس قانون کے نفاذ میں کوئی مشکل ہو تو حکومت گزٹ نوٹیفکیشن کے ذریعے ایسے احکامات اور ہدایات جاری کرسکتی ہے جو اس قانون کے نفاذ کے لیے ضروری ہوں اور متوقع مشکلات کو دور کرنے میں مدد دے سکیں لیکن اس قانون کے احکام سے متصادم نہ ہوں۔

تاہم ایسا کوئی حکم،اس قانون کے نافذ العمل ہونے کے دوسال کے بعد جاری نہیں کیا جاسکتا۔

فقہ و قانون مکرم محمود

جینڈر ڈسکورس

جدیدیت کے آدرشوں میں سے ایک بڑا آدرش انسانی ارادہ اور اختیار پر عائد حد بندیوں اور رکاوٹوں کو دور کرنا ہے یعنی آزادی کے دائرہ کو مستقل بڑھاتے رہنا ہے اور یہ بڑھوتری انفسی بھی ہونی چاہیے اور آفاقی بھی، یعنی انسانی جسم و نفس اور کائنات دونوں کو انسانی آزادی کے دائرے میں لانا مقصود ہے۔ اسی کو اگر ایک اور انداز میں دیکھا جائے تو جدیدیت اولاً وجود و شعور کی ثنویت ہے اور ثانیاً وجود کو شعور کے تابع کرنے کا عنوان ہے یعنی مادہ کو ذہن کے تابع کر دیا جائے۔ وہ اصلاً حقیقت کی تخلیق کرنا چاہتی ہے۔ حقیقت کا ادراک اور تفہیم ثانوی اور ضمنی ہے اور تخلیق کے عمل کو ہی اعلیٰ سطح پر انجام دینے کے کام آتی ہے۔ وجود آفاقی سطح پر کائنات طبیعی ہے اور انسانی سطح پر جسم ہے۔ طبیعی فطرت اور جسم دونوں کو تابعِ شعور یعنی ارادہ و اختیار کے تابع کرنا جدیدیت کا مطلوب ہے۔

جدید سائنس اور ٹیکنو سائنس نے آفاقی طبیعی فطرت پر انسانی اختیار اور ارادہ کی کارفرمائی کو حیرت انگیز حدود تک پہنچا دیا ہے۔ جدید سائنس کی اساس اور مقصد انسانی آزادی کی ہی بڑھوتری ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر چیز انسان کے زیر اختیار آ سکتی ہے اور نہ آئی ہے لیکن روایتی انسان کے مقابلے پر جدید انسان کی آزادی کا دائرہ سائنس کی مدد سے بہت وسیع ضرور ہو گیا ہے۔ فطری آفاقی رکاوٹوں اور حد بندیوں کو دور کرنے کے لیے جدید سائنس وجود میں آئی ہے۔ معاشرتی حد بندیوں کو ایک حد پر رکھنے کے لیے سول سوسائٹی (ایسا معاشرہ جہاں انسانی باہمی تعلقات کی بناء مفاد کے اصول پر ہو) اور سیاسی حد بندیوں کو انسانی حقوق اور آزادی کی حفاظت میں ہی صَرف کرنے کے لیے جمہوریت، جدید جینڈر ڈسکورس اور (+LGBTQ کی پوری تحریک) کو بھی آزادی کے دائرے کے پھیلاؤ کے ضمن میں سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ جسم اور جسمانی اظہار پر انسانی اختیار و ارادہ کی حاکمیت کا اعلان ہے اور انسانی جسم اور انسانی نفسیات کے مابین تعلق کی تشکیلِ نو ہے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ جسم کی شعور کے خلاف بغاوت ہے جس میں ردِّ انسانیت

(Dehumanization) کا عمل انسان کی حیوانی تعبیر کے زیر سایہ اپنی کرشمہ سازیاں دکھا رہا ہے۔انسان کی حیوانی تعبیر کا خصوصی ظہور مابعد جدید عہد میں ہوا ہے اس سے پہلے انسان کی مشینی تعبیر کی کارفرمائی تھی جو سرمایہ داری کے لیے تو یقیناً مفید مطلب تھی (انسان سسٹم کی مشین میں ایک چلتے پرزے کے طور پر کام کرتا رہتا تھا مزاحمت کی آواز پیدا کیے بغیر) مگر انسانی اظہار پر کچھ قدغنیں عائد کرتی تھی۔دوسرے لفظوں میں کچھ بنیادوں اور حدود کی بہر حال قائل تھی۔انسان کی حیوانی تعبیر ہر قسم کی حدود اور بنیادوں کی نفی پر قائم ہے (سرمایہ داری نے اس سے کچھ اور مفادی جہات ڈھونڈھ نکالی ہیں)۔تقریباً تمام روایتوں میں جنڈر کو Binary ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔ جینڈر کو Binary قرار دینا امکانات کو بہت محدود کر دیتا ہے اور اسے Spectrum سمجھنا لامحدود امکانات کا در وا کر دیتا ہے۔ Binary کا مطلب ہے Female/Male متعین تشخصات ہیں اور جس کے بارے میں ان میں سے ایک کی تعیین ممکن نہ ہو وہ ابنارمل ہے جس کو نارمل بنانے کے لیے طبی اور نفسیاتی طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔سپیکٹرم سمجھنے سے مراد یہ ہے کہ مرد اور عورت کوئی قطعی اور متعین تشخصات نہیں ہیں بلکہ ان کے بیچ میں بھی بہت سے تشخصات ممکن ہیں اور وہ سب نارمل کے دائرے میں آتے ہیں۔

اس ڈسکورس کے مطابق انسان کا مرد اور عورت کے تشخص کا حامل ہونا اس پر جبر ہے۔ انسانی آزادی کے دائرہ کو بڑھانے اور جبر کو محدود کرنے کے لیے لازمی ہے کہ اس مردانہ وزنانہ تشخص اور بیچ میں تمام ممکنہ تشخصات کو بھی انسانی اختیار وارادہ کے تحت لایا جائے اور انسان کیا ہے باعتبار جینڈر اس کے تعین کا اختیار ایک فرد کو دیا جائے۔اور ایسے افراد کو جو اپنے پیدائشی دیے گئے جینڈر پر راضی نہ ہوں اور اپنے تشخص کو اپنے ارادہ سے متعین کرنا چاہیں یا اپنے تشخص کے غیر متعین رہنے پر ہی اصرار کریں ان کو قانونی،طبی اور نفسیاتی مدد فراہم کی جائے اور ایسے لوگوں کے انسانی حقوق کے لیے آواز بلند کی جائے اور جو لوگ اس پر اعتراض کریں ان پر مختلف طرح Phobias کا الزام لگایا جائے (مثلاً Trans Phobia)۔اس وقت جینڈر کی جو بحث جاری ہے اس میں ٹرانس جینڈر قانون اور انسان کو دیے جانے والے اس اختیار کے خلاف بات کرنے والوں پر اس کے حامیوں کی طرف سے Trans Phobic ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔اور انہیں بنیادی انسانی حقوق کا انکاری قرار دیا جائے۔جدید جینڈر ڈسکورس کی یلغار کے پیچھے وہی

انسانی آزادی کا فلسفہ ہے جو آزادی کو ہی بنیادی انسانی اعلیٰ قدر قرار دیتا ہے اور آزادی میں لامتناہی اضافہ کو ہر انسانی انفرادی اور اجتماعی عمل کا مقصدِ وحید گردانتا ہے۔

جدید جینڈر ڈسکورس کا ایک قریبی تعلق آزادیٔ اظہار سے بھی ہے۔ اظہار صرف زبان سے نہیں ہوتا بلکہ Gender and Body Expression بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔ انسان کا اپنی صنف اور جسم کا کسی بھی طرح کا اظہار انسان کا بنیادی حق ہے اور اس کے دائرہ اختیار کے تحت آتا ہے۔ کسی ایک طرح کے اظہار پر انسان کو مجبور کر دینا چاہے وہ مجبور کر دینے والا کوئی بھی ہو، جبر ہے اور آزادی کے جبر کے علاوہ کوئی جبر قابل قبول نہیں ہے۔ ہمارے معاشروں کے لیے جدید جینڈر کے مباحث قطعی اجنبی ہیں اور ان پر ہم جب اپنے روایتی فقہی مباحث کی روشنی میں نظر ڈالتے ہیں تو خلط مبحث پیدا ہوتا ہے کیونکہ یہ سارا ڈسکورس مکمل طور پر جدید ہے کیونکہ یہ جنس (Sex) اور صِنف (Gender) کے لازمی اور خِلقی رشتے کو اور صِنف کی واضح حدود اور امتیازات کو تسلیم نہیں کرتا اور جنڈر کو مکمل طور پر ایک سماجی تشکیل قرار دیتا ہے جس کا انسانی جسم کی طبیعی ساخت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے علاوہ روایتی فقہی بحوث اس مسئلہ پر صرف طبی اور جسمانی دائرہ تک محدود تھیں مثلاً خنثیٰ مشکل کی بحث۔ جبکہ جدید مبحث کا زیادہ تر حصہ نفسیاتی مسائل پر مشتمل ہے۔ مثلاً وہ نفسیاتی دباؤ جو آدمی اپنی پیدائشی جنس اور صِنف میں عدم مطابقت کی صورت میں محسوس کرتا ہے۔ یہ بحث ہمارے لیے نئی ہے اور اس کو ''دی گئی صورت حال'' اور نظریاتی سیاق وسباق میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ فیمنزم کی طرح اس ڈسکورس کی بھی ہمارے ہاں ''درآمد'' ہوئی ہے اور ہو رہی ہے اور اس کے بہت خطرناک اور دور رَس نتائج ہیں جن کا فوری ادراک ضروری ہے۔ یہ پورا ڈسکورس انفسی فطرت میں فساد کا مظہر ہے۔ آفاقی فطرت میں فساد کا تذکرہ تو ماحولیاتی تبدیلیوں اور بحران کی صورت میں عام ہونے لگا ہے۔ Envoirnmental Crisis کے ساتھ ساتھ انسانیت ایک Human Psychological Crisis کا بھی شکار ہے۔ اس مبحث کی صحیح تفہیم کسی مزاحمت اور ردّ عمل سے قبل لازمی ہے اور اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

فقہ و قانون

سید خالد جامعی

ٹرانس جینڈر ایکٹ اور اسلامی تنظیموں کا ردّعمل
ایک فکری جائزہ

اس وقت ملک میں ٹرانس جینڈر ایکٹ کا مسئلہ اسلامی تنظیموں کی جانب سے انتہائی زور وشور کے ساتھ اٹھایا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ مسئلہ کئی حوالوں سے اسلامی تنظیموں کے تضادات اور ذہنی خلفشار کی نشان دہی کرتا ہے۔ اسلامی تنظیمیں ابھی بھی مسائل کی جڑ سے نہیں بلکہ صرف شاخوں سے الجھ رہی ہیں۔ ہم نے کچھ سوالات تیار کیے ہیں جن پر ہفتہ وار نشست میں طویل گفتگو بھی ہوئی۔ ان سوالات کا مقصد علماء اور اسلامی تنظیموں کی جانب سے جدید ریاست کی اساس، مابعدالطبیعیات اور ثقافتی تناظر کو ایک سنجیدہ مسئلہ کے طور پر پیش کرنا ہے اور یہ واضح کرنا ہے کہ جدید ریاست نے عالم اسلام میں صرف شرعِ اسلامی کو کالونائز نہیں کیا بلکہ اسلامی تاریخ وعلمیت کے ان موضوعات کو جو اسلامی تاریخ میں نان ایشوز تھے، ان سب کو چوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔ یہ ایکٹ اور اس پر اسلامی تنظیموں کا ردّعمل اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔

جہاں تک جدید ریاست کا تعلق ہے یہ اہم ترین موضوع ہے۔ اس ریاست کو جانے بغیر ہماری جدوجہد نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی۔ جدید ریاست کے موضوع پر ہم نے کراچی، لاہور، بہاولپور میں ۲۲ گھنٹوں پر مشتمل گفتگو کی ہے جو آڈیو کی صورت میں موجود ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر امین صاحب نے بہت عمدہ اور اہم سوالات اٹھائے جن کا تفصیلی جواب ان شاء اللہ دیا جائے گا۔ یہ سوالات اس مضمون کے آخر میں درج ہیں۔ جدید ریاست کے بارے میں علماء کو شبہ ہے کہ یہ درست نہیں ہے۔ اسی لیے علماء نے جہاد کا حق تو ریاست کو دے دیا لیکن زکوٰۃ کا شعبہ ریاست کے حوالے نہیں کیا لہٰذا جدید ریاست کو اگر گہرائی سے سمجھ لیا جائے تو جمہوریت پر بحث خود بخود بے معنی ہوجاتی ہے اور صورت یہ نکلتی ہے کہ اصل تنقید تو جدید ریاست پر ہونی چاہیے۔

سوالات

* پاکستان میں ٹرانس جینڈر کے مسئلے پر اسلامی تنظیموں اور علماء کرام کا ردّعمل کن فکری

تضادات کی نشاندہی کرتا ہے؟

* ٹرانس جینڈر ایکٹ سے اسلامی قوتوں اور علماء کا اصل اختلاف کیا ہے؟

* کیا اس وقت اسلامی تنظیمیں ایکٹ کی مخالفت سازشی تھیوری کی بنیاد پر کررہی ہیں؟ یا بیس پچیس سال بعد آنے والے ممکنہ نتائج کی بنیاد پر کررہی ہیں یا ان کا اس قانون سے کوئی جوہری اختلاف ہے؟ اسلامی تنظیموں کا اصل اختلاف تو صنف اور جنس کی تقسیم پر ہونا چاہیے اور اسی پر اصل گفتگو ہونی چاہیے۔ اس کا تعلق صرف ٹرانس جینڈر سے نہیں تحریک نسواں سے بھی ہونا چاہیے اسلامی تنظیمیں سب سے کم اظہار اسی نکتے پر کیوں کررہی ہیں؟

* کیا اسلامی تنظیموں کا اختلاف محض ٹرانس جینڈر کی اصطلاح کے استعمال پر ہے یا ان کا اختلاف اس حوالے سے کسی اور مسئلے پر بھی ہے؟

کہا یہ جارہا ہے کہ ٹرانس جینڈر کی اصطلاح ختم کر کے انٹرسیکس (Inter Sex) کی اصطلاح قبول کر لی جائے اور ان کی شناخت کے لیے میڈیکل بورڈ قائم کیا جائے؟ کیا اسلامی تنظیموں کو اس بات کا یقین ہے کہ انٹرسیکس کی صرف ایک ہی قسم ہوتی ہے اور کیا یہ وہی خنثیٰ مشکل کی قسم ہے جس کا ذکر فقہاء کے ہاں موجود ہے جب کہ Gender Studies کے ماہرین انٹرسیکس کی کئی قسمیں بیان کرتے ہیں اور اس حوالے سے آنے والی مزید تعبیرات انٹرسیکس اور ٹرانس جینڈر کے درمیان کئی قسمیں بیان کررہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا انٹرسیکس کی سیاسی شناخت کو مان لینے کے بعد اسلامی تنظیمیں غلطی کے اس دائرے میں داخل ہونا چاہتی ہیں جس کی وہ مخالفت کررہی ہیں۔

* کیا ٹرانس جینڈر بل کا قضیہ اسلامی تنظیموں اور علماء کا فرد اور ریاست پر حد سے زیادہ اعتماد ظاہر نہیں کرتا؟

* کیا اس مسئلے کا اصل سبب State Monoplization of Identity ہے؟

کیا ٹرانس جینڈر کا قضیہ اسلامی تنظیموں کا مسلم معاشرے پر حد سے زیادہ عدم اعتماد ظاہر نہیں کرتا؟ شریعت میں جنس کے تعین کا مسئلہ معاشرہ اور روایتی تعلقات طے کرتے ہیں اور یہ تعین کسی سیاسی شناختی دستاویز کی بنیاد پر نہیں بلکہ خالص مشاہدے کی بنیاد پر ہے تو کیا اس مسئلے کا علاج

یہ نہیں کہ جنس کے سیاسی تعین کا خاتمہ کیا جائے اور اس مسئلے کو خالصتاً معاشرتی بنیاد پر حل کیا جائے؟ کیا پاکستانی معاشرہ اس وقت ریاست اور فرد سے زیادہ جنس کے بارے میں باشعور نہیں؟

سینیٹر مشتاق احمد اور دیگر کا مؤقف یہ ہے کہ اس قانون کے ذریعے کوئی بھی مرد عورت کی شناخت حاصل کر سکتا ہے یعنی اگر وہ نادرا سے کہے کہ میں عورت محسوس کر رہا ہوں تو نادرا اس کے محض اس بیان پر عورت کا کارڈ دے دے گا اور پھر یہ مرد عورت کا کارڈ لے کر خواتین کے باتھ روم اور سوئمنگ پول میں گھس جائے گا اور خواتین بھی اسے کچھ نہیں کہہ سکیں گی حتیٰ کہ کسی مرد سے عورت بن کر نکاح بھی کر لے گا۔ مولوی صاحب اور عدالت بھی اس نکاح کو قبول کر لیں گے کیونکہ کارڈ پر عورت لکھا ہے۔ اس طرح اسے قانونی تحفظ حاصل ہوگا کہ ایک مرد عورت بن کر مرد سے نکاح کر لے اور معاشرہ بھی اسے قبول کر لے۔ کیا یہ نقطۂ نظر درست ہے؟

سینیٹر مشتاق احمد اور ان کے حامیوں کا یہ بھی مؤقف ہے کہ اس قانون کے ذریعے ہم جنسوں کی شادیاں عام ہو جائیں گی۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستان کے کئی ہم جنس پرست اس قانون کے انتظار میں بیٹھے تھے کہ یہ قانون پاس ہو اور مرد مرد سے اور عورت عورت سے نکاح کر سکے کیونکہ پاکستانی ہم جنس پرست انتہائی دین دار ہیں کہ نکاح کے بغیر کسی دوسرے ہم جنس مرد و عورت کو ہاتھ لگانا غلط سمجھتے ہیں اور ہم جنس پرستی کے جواز کے لیے نکاح کو ضروری سمجھتے ہیں۔ کیا یہ خیال درست ہے؟ جو حل اس وقت سینیٹر مشتاق احمد پیش کر رہے ہیں اگر ان کی تجویز کے مطابق میڈیکل بورڈ تشکیل دیا جاتا ہے (جس کے آثار بھی نہیں) تو کیا اس کے نتیجے میں انٹرسیکس کا صحیح تعین ہو سکتا ہے؟ خنثیٰ مشکل کا صحیح تعین ہو سکتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ کیا میڈیکل بورڈ کا فیصلہ محض جنس کی ظاہری فزیالوجی کی بنیاد پر کرے گا یا کروموسوم کی بنیاد پر کرے گا؟ اگر میڈیکل بورڈ کسی مرد یا عورت کے بارے میں جس کے اعضاء مکمل ہیں یہ کہے کہ اس عورت میں مرد کے کروموسوم زیادہ ہیں یا مرد میں عورت کے کروموسوم زیادہ ہیں لہٰذا یہ بھی انٹرسیکس کی کسی ایک قسم میں آتے ہیں تو اس موقع پر علماء اور اسلامی تنظیموں کا کیا ردّ عمل ہوگا؟

کیا اصل پیچیدگی کی وجہ ریاست پر حد سے زیادہ اعتماد اور معاشرے پر کم اعتماد ہے؟ پاکستانی معاشرہ اس وقت بھی اس قدر باشعور ہے کہ یہاں میک اپ کیا ہوا ہیجڑا بس میں عورتوں کے حصے میں بیٹھنے کی بجائے مردوں کے حصے میں بیٹھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسے معاشرے میں

جنس کو سیاسی طور پر ہی کیوں متعین کیا جارہا ہے؟ کیا اسلامی تاریخ میں جنس کا تعین سیاسی بنیادوں پر متعین ہوتا تھا۔

کیا اسلامی تنظیموں نے غلطی سے عوام تک Gender Studies کے وہ مباحث بھی پہنچا دیئے جن کو پہنچانے کی ضرورت نہ تھی؟ نہ انہیں عوامی موضوع بنانے کی حاجت تھی؟ کیا جینڈر کا موضوع جو ایک سیاسی مسئلہ بن چکا ہے اور اس کا آخری حل اسلامی مفکرین یہ پیش کررہے ہیں کہ اسے ڈاکٹروں کے سپرد کردیا جائے یعنی یہ مسئلہ علماء، فقہاء، اسلامی علمیت اور معاشرت کی دسترس سے نکل کر میڈیکل اسٹیبلشمنٹ اور ریاست کا مسئلہ بنادیا جائے جس میں آخری فتح سیکولر لبرل ریاست کی ہو؟

کیا اس مسئلے کو ختم کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہوسکتا کہ شناختی کارڈ وغیرہ سے Sex اور Gender کا خانہ ہی ختم کردیا جائے اور کسی کی شناخت کے مسئلے کو معاشرت اور معاشرے پر چھوڑ دیا جائے؟

کیا اسلامی تنظیموں کے علم میں یہ بات نہیں کہ ۱۹۷۳ء سے پہلے شناختی کارڈ ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت جنس کا تعین کیسے ہوتا تھا؟ تب یہ معاشرتی مسئلہ تھا آج سیاسی مسئلہ ریاست کی وجہ سے ہے؟

ان سوالات پر مدیر البرہان کا تبصرہ

* آپ نے علماء کو یہ تو بتایا ہے کہ وہ جدید ریاست کو نہیں سمجھتے لیکن اس مسئلے کا حل نہیں بتایا۔ یعنی فرض کیجیے کہ وہ جدید ریاست کو اُسی طرح سمجھ لیں جس طرح آپ سمجھتے ہیں تو وہ کیا کریں؟ جدید ریاست کے بارے میں ان کا ردّعمل اور منہج کیا ہونا چاہیے؟

* ریاست کے جس تصور کو آپ ''صحیح اسلامی ریاست'' سمجھتے ہیں وہ تصور کیا ہے؟ کیا آپ کا تصورِ اسلامی ریاست اور علماء کرام کا تصورِ اسلامی ریاست ایک ہی ہے؟ عصر حاضر میں وہ اسلامی ریاست کیسے قائم ہوگی؟ علماء کرام اس کے لیے کیا منہج اختیار کریں؟

* آپ کی رائے میں اب علماء کرام کو ٹرانس جینڈر ایکٹ کے مسئلے سے نمٹنے کے لیے کیا مؤقف اختیار کرنا چاہیے؟

فہم دین سید ابوالحسن علی ندویؒ

جمہور اہل سنت سے جڑے رہنے میں عافیت ہے

اپنے کو نیلام کی منڈی میں پیش نہ کیجیے

محمد احمد حافظ لکھتے ہیں: حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے نام سے کون واقف نہیں۔اعتدالِ مزاج اور اعتدالِ تنقید میں ان کے شریک وسہیم بہت کم لوگ ہوں گے۔''قدیم نافع اور جدید صالح'' کے اصول پر نہ صرف خود عمل پیرا ہوئے بلکہ اس کو ندوہ کا شعار بنایا۔بندہ میٹرک میں پڑھتا تھا تو اس وقت دیگر کتابوں کے مطالعے کے ساتھ کراچی سے صدیقی ٹرسٹ کے تحت شائع ہونے والے بہت مفید علمی اور دینی رسائل پڑھنے کا موقع ملتا تھا۔اس مطالعے سے ذہن دینی تعلیم کی طرف مائل ہوا اور اللہ نے مدرسے میں پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی۔اسی سلسلے میں ایک مختصر رسالہ ''اپنے کو نیلام کی منڈی میں پیش نہ کیجیے'' مطالعے میں آیا جو اصلاً مولانا ندویؒ کا علومِ دینیہ کے طلبہ سے ایک خطاب تھا۔سارا خطاب ہی بہت پسند آیا لیکن اس کے آخر میں مولانا نے طلبہ کو چار نصیحتیں کی تھیں،ان میں سے ایک بات کا دل پر بہت گہرا اثر ہوا۔یہ خطاب اب مولانا کے مجموعۂ خطبات،''خطباتِ علی میاں'' کی پہلی جلد میں شامل ہے۔اس کا متعلقہ حصہ یہاں نقل کرتا ہوں۔گمان نہیں بلکہ یقین ہے کہ بہت سے دوستوں کو اس میں جمود محسوس ہوگا لیکن معلوم نہیں کیوں آج کے دور میں بار بار اس کی طرف ذہن جاتا ہے؛فرماتے ہیں:

''تیسری بات جو بہت تجربہ کی ہے وہ یہ ہے کہ مَیں نے بھی کتابیں پڑھی ہیں،اسلام کے مذاہبِ اربعہ اور ان سے باہر نکل کر تقابلی مطالعہ کیا ہے،شاید کم ہی لوگوں نے اس طرح کا مطالعہ کیا ہو۔ان تمام کے مطالعے کے نچوڑ میں ایک گُر کی بات بتاتا ہوں کہ جمہور اہلِ سنت کے مسلک سے کبھی نہ ہٹیے گا۔اس کو لکھ لیجیے،چاہے آپ کا دماغ آپ کو کچھ بھی بتائے،آپ کی ذہنیت آپ کو کہیں بھی لے جائے،کیسی ہی قوی دلیل پائیں،جمہور کے مسلک سے نہ ہٹیے۔اللہ تعالیٰ کی جو تائید اس کے ساتھ رہی ہے،اس کے شواہد وقرائن ساری تاریخ میں موجود ہیں۔چونکہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کو باقی رکھنا تھا اور باقی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی اصل حالت پر قائم رہے،ورنہ بدھ

مذہب کیا باقی ہے؟ عیسائیت کیا باقی ہے؟ عیسائیت کے بارے میں قرآن کا 'ولا الضالین' کہنا ایک معجزہ ہی ہے،یعنی وہ پٹڑی سے بالکل ہٹ چکی تھی، اور اللہ تعالی نے چونکہ اس دین اسلام کے بارے میں فرمادیا ہے'إِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ 'اور اس کے ساتھ جو تائید ہے، جو قوی دلائل ہیں، جو سلامتِ فکر اور سلامتِ قلب ہے، اس کے ساتھ جو ذہین ترین انسانوں کی محنتیں اور غور وخوض کے نتائج ہیں اور ان کا جو اخلاص ہے اور ذہن سوزی ہے، وہ کسی مذہب کو حاصل نہیں ہے۔ یہ وہ بات ہے جو ہمارے اور آپ کے استاد مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے بعض شاگردوں سے کہی، جیسا کہ مولانا اویس صاحب نقل کرتے تھے اور سید صاحبؒ سے ان کے استاد مولانا شبلیؒ نے کہی تھی۔ بعض لوگ چمک دمک والی تحریر پڑھ کر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ 'وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُعۡجِبُكَ قَوۡلُهُ فِي الۡحَيَاةِ الدُّنۡيَا وَيُشۡهِدُ اللّٰهَ عَلَى مَا فِي قَلۡبِهِ '(بعض لوگوں کی باتیں تم کو دنیا میں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں، حالانکہ اللہ ان کے دل کے حال سے آگاہ ہے۔)۔ وہ شہیدوں کا مذاق اڑاتے ہیں، کہیں علمائے سلف کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہیں مفسرین ان کے تیر کا نشانہ بنتے ہیں، لہذا مسلک جمہور سے اپنے کو وابستہ رکھیے، اس کا بڑا فائدہ ہوگا، اللہ کی خاص عنایت ہوگی، اس کی نصرت و برکت ہوگی اور حسنِ خاتمہ بھی ہوگا۔''

(خطباتِ علی میاںؒ، ج1، ص348۔349)

بقیہ: جاوید احمد غامدی۔سیکولرازم کی حمایت

تصورِ نظمِ قرآن، خود قرآن سے نہیں لیا گیا، قرآن پر نافذ کیا گیا ہے۔ یہ اتنا پیچیدہ سا تصورِ نظم ہے کہ کسی کتاب ہدایت کو سمجھنے کی کلید نہیں بن سکتا۔ کوئی کتاب ہدایت اس طرح کی مہماتی بندش پیدا نہیں کر سکتی۔ اللہ کے کلام کی کوئی روایت بھی اس تصورِ نظم میں ملحوظ نظر نہیں آتی۔

غامدی صاحب کی فکر کا اظہار جیسے ترجمے کی طرح ہو رہا ہے، سیکولرزم اور جدیدیت کے متن کو یہ دینی اصطلاحات اور اردو زبان میں بیان کر رہے ہیں۔ تو یہ میری رائے میں بہت خوفناک صورتحال ہے۔ مکمل گفتگو اس ویڈیو میں سنی جاسکتی ہے:

https://youtu.be/lycS5LnZlWI

(جناب شاہد اعوان صاحب کی وال سے)

فہم دین احمد جاوید

جاوید احمد غامدی۔سیکولرازم کی حمایت

سلسلۂ گفتگو کے نویں پروگرام میں گفتگو کا موضوع یہ سوال تھا کہ''آج کی دنیا میں دینی روایت پر کیسے رہا جائے اور جدیدیت نے دین کے لیے جو چیلنجز پیدا کر دیے ہیں ان کا جواب کہاں ڈھونڈا جائے؟ نیز اس پسِ منظر میں آپ غامدی صاحب کی فکر کو کیسے دیکھتے ہیں؟''

اس کے جواب میں احمد جاوید صاحب نے کہا کہ:

''جدیدیت کا واحد چیلنج الحاد نہیں ہے،الحاد تو اب جدیدیت کا فیصلہ ہے۔

انسان کی اجتماعیت کے جتنے دائرے ہیں ان میں دین،خدا اور شریعت کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیے،یعنی جدید دنیا کہہ رہی ہے کہ ہم نہیں ہونے دیں گے۔

جدیدیت کیا ہے؟ سیکولرزم کو قوت فراہم کر کے حجت بنا دینے والا مزاج ،قوت ، رویہ وغیرہ۔

ہمارے یہاں سیکولر عقائد کی وکالت کا سب سے موثر ذریعہ،افسوس ہے کہ،غامدی صاحب ہیں۔

غامدی صاحب کا جدید چیلنجز سے نمٹنے کے لیے ان سے سازگاری پیدا کر لینے کو دین اور اللہ کے کلام کا تقاضا بنا کر پیش کرنا بہت ہولناک ہے، بھیانک ہے۔لیکن افسوس کہ ایسا کیا جارہا ہے اور ایک ایسے ذہن کی طرف سے جو صاحب علم ہے،جس کی باتیں اثر رکھتی ہیں، یہ خطرہ محسوس کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

جو لوگ اعلانیہ ملحد ہیں، ان کے ساتھ یہ لوگ (غامدی صاحب) بہت خوشگوار تعلق میں جڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ۔جہاں انہیں کام کرنا چاہیے وہاں یہ مؤدب ہیں اور جن بے چاروں کو چھوڑ دینا چاہیے (کمزور یا عام مسلمان) ان پر یہ جیسے شمشیر بے نیام بنے رہتے ہیں۔''تفصیل کے لیے دیکھیے۔ (بقیہ صفحہ نمبر:٥٩)

اسلام اور مغرب

ڈاکٹر رضوان اسد خان

اقوام متحدہ کے قوانین
مسلم خاندانی نظام کی تباہی کا سامان

سیڈا (Convention for Elimination of Discrimination Against Women) (CEDAW) اقوام متحدہ کا، عورتوں کے حقوق سے متعلق چارٹر ہے جس پر پاکستان نے دسمبر 1996ء میں دستخط کر کے اسے تسلیم کیا تھا۔

اب یا تو ہمارے مقتدر حلقے اسلام سے بالکل جاہل ہیں، یا بیرونی سازشوں کے دست و پا۔ کیونکہ اسی کنوینشن کو جن بنیادوں پر سعودی عرب نے ڈنکے کی چوٹ پر رد کر دیا تھا، وہ ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ اس کنونشن میں کہا گیا ہے کہ عورت بھی مرد جیسی ہے جبکہ قرآن کہتا ہے کہ مرد عورت جیسا نہیں ہوتا۔

۲۔ اس کنونشن کے مطابق مرد ایک سے زیادہ شادیاں نہیں کر سکتا جبکہ اسلام چار تک شادیوں کی اجازت دیتا ہے۔

۳۔ اس کنونشن کے مطابق بچوں کو ان کی ماؤں کے نام سے پکارنا چاہیے (مثلاً نومولود بچے جن کا اپنا نام ابھی نہیں رکھا گیا ہوتا) جبکہ اسلام میں اولاد کو اس کے باپ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

۴۔ اس کنونشن کے مطابق بیوہ یا طلاق یافتہ عورت کی کوئی عدت نہیں ہونی چاہیے۔ وہ جب چاہے نکاح کر لے۔ اسلام بیوہ اور مطلقہ کو عدت کے دوران نکاح سے سختی سے روکتا ہے۔

۵۔ اس کنونشن کے مطابق مرد عورت اور اپنی بالغ بیٹیوں کا سرپرست نہیں ہو سکتا جبکہ اسلام نے مرد کو قوام اور خاندان کا سربراہ قرار دیا ہے۔

۶۔ اس کنونشن کے مطابق مرد اور عورت کی وراثت برابر ہونی چاہیے جبکہ اسلام میں بہنوں کا حصہ بھائیوں سے آدھا ہے۔

۷۔ اس کنونشن کے مطابق عورت کو عورت سے نکاح کی اجازت ہونی چاہیے جبکہ شریعت میں اس کا تصور بھی محال ہے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۲۹)

کہتا ہوں سچ باغی

پاکستان کی دینی سیاسی جماعتیں

پاکستان میں عدم نفاذ شریعت کی بڑی حد تک ذمہ دار ہیں

جی ہاں! ہمارے سیاسی اور فوجی حکمران اور اشرافیہ یعنی ہمارے حکمران طبقات اور اسٹیبلشمنٹ (بیوروکریسی، عدلیہ، فوج وغیرہ) بھی پاکستان میں عدم نفاذ شریعت کے ذمہ دار ہیں لیکن اگر غور سے دیکھیں تو اس کی ذمہ داران سے زیادہ ہماری دینی سیاسی جماعتیں ہیں کیونکہ حکمرانوں سے تو عوام کو توقع ہی نہیں کہ وہ اسلام نافذ کریں گے کیونکہ ہماری سیاسی جماعتیں تو اسی طرح کی سیکولر سیاسی جماعتیں ہیں جس طرح کی مغربی جمہوریت میں ہوتی ہیں یعنی ان کے پیش نظر ہے اقتدار میں آنا اور ملک چلانا۔ چونکہ پاکستان میں دینی قوتیں بھی برسرِ عمل ہیں اور عوام بھی مسلمان ہیں لہٰذا ان کی نمائندگی کی دعوے دار سیاسی جماعتیں (مسلم لیگ، پیپلز پارٹی، تحریک انصاف وغیرہ) ان کی خاطر ہمیشہ اپنے پروگراموں کو دینی ٹچ دیتی ہیں لیکن ظاہر ہے نفاذ دین نہ ان کی بنیادی ترجیح ہوتی ہے اور نہ لوگ ان سے اس کی توقع کرتے ہیں۔

یہ کام تو بنیادی طور پر ہماری دینی سیاسی جماعتوں کا تھا جو نفاذ اسلام کی علمبردار تھیں کہ وہ پاکستان میں ایسے حالات پیدا کرتیں کہ لوگ ان کو ووٹ دیتے اور وہ کامیاب ہو کر پاکستان میں برسرِ اقتدار آتیں اور ملک میں دین نافذ کرتیں لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہو سکا۔ اور اگر ایسا نہیں ہوا تو یہ کوئی حادثہ نہیں ہے بلکہ اس کے ٹھوس اسباب موجود ہیں۔ اگر ہم ان اسباب کا مدلل ذکر کریں تو بات طویل ہو جائے گی اور ہمیں مدیر البرہان نے صرف ایک دو صفحوں کی اجازت دی ہے لہٰذا ہم محض اشارات پر اکتفا کریں گے۔

ا۔ پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں نے یہ بات نہیں سمجھی کہ صرف انتخابات میں حصہ لینا اور سیاسی جدوجہد کرنا ہی اقتدار میں آنے کے لیے کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے ملک میں ایسا ماحول پیدا کرنا بھی ضروری ہے کہ عوام انہیں ووٹ دیں۔ اس کے لیے عوام کی دینی تعلیم و تربیت کرنا ایک بنیادی عامل تھا۔ دینی اصلاحی اور دعوتی و تبلیغی جماعتوں، دینی مدارس، مساجد وغیرہ کی

حمایت بھی اس کے لیے درکار تھی۔تحریک پاکستان میں اسلام کے حق میں جو فضا قائم ہوئی تھی، اسے بھی کیش کرانا ضروری تھا۔

۲۔ اور سب سے بڑھ کر اس امر کی ضرورت تھی کہ ساری دینی سیاسی جماعتیں متحد ہو جاتیں لیکن انہوں نے متحد ہونے کی بجائے ہر ایک نے اپنے مسلک کو بنیاد بنایا اور آپس میں مقابلہ بازی شروع کر دی۔نتیجتاً،ان کی ہوا اکھڑ گئی،وہ ناکام ہوگئیں اور لوگوں نے انہیں ووٹ دینا بند کر دیے۔

۳۔ وہ اپنے دشمن کو نہیں سمجھ سکیں۔ان کا حقیقی دشمن مغرب ہے جو پاکستان میں (اور سارے مسلمان ملکوں میں بلکہ ساری دنیا میں) اپنی الحادی فکر وتہذیب نافذ کرنا چاہتا ہے، مسلمانوں کو دین سے دور کرنا چاہتا ہے اور دینی قوتوں کو ناکام بنانا چاہتا ہے چنانچہ اس نے مقامی حکمران ایجنٹوں اور ان کی خفیہ ایجنسیوں سے مل کر دینی سیاسی جماعتوں کو آپس میں لڑایا،کمزور کیا اور انہیں انتخابات میں ہروایا۔

۴۔ اکثر دینی سیاسی جماعتیں یا تو اسٹیبلشمنٹ کی پیداوار ہیں یا اس کے ہاتھوں میں کھیلتی ہیں اور مقامی حکمران اور اسٹیبلشمنٹ ، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں میں کھیلتی ہے یا خود کو ان کے آگے مجبور پاتی ہے کیونکہ وہ دین اور نظریے کی قوت سے محروم ہے۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بعض دینی عناصر ترقی کر کے بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ کے لیے کام کرنا شروع کر دیتے ہیں جیسا کہ مولانا فضل الرحمٰن نے فاٹا کے انضمام کی مخالفت کی،فوج کو گالیاں دیں اور پی ڈی ایم بنوائی یہاں تک کہ بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ کی خواہش پوری ہوگئی اور اس کی پسندیدہ حکومت وجود میں آگئی اور مقامی اسٹیبلشمنٹ نے بھی اس سے رجوع کر لیا۔

۵۔ اور آخری اور سب سے بڑھ کر خطرناک اور مایوس کن بات یہ کہ دینی سیاسی جماعتوں میں خود احتسابی کی کوئی روایت نہیں اور ملک میں کوئی ایسا ادارہ،کوئی ایسی اصلاحی قوت موجود نہیں جو ان دینی سیاسی جماعتوں کی اصلاح کرے اور ان کی قیادت کو بتائے کہ اخلاص اور فراست سے محروم ہو کر صرف قعرِ ذلت ہی میں گرا جا سکتا ہے،عروج نہیں پایا جا سکتا۔

Defending the Islamic Afghanistan
Economic and Political Dimensions

The Islamic Emirate and its Taliban regime are constantly under imperialist attack. Developing a political and economic strategy to defeat the assault on a permanent basis is of the utmost importance. This paper attempts to outline a possible strategy for meeting this challenge.

The Nature of the Attack and its Objectives

At present the enemy's main reliance is on the development of terrorist movements in Afghanistan. Anti-Islamic groupings in Europe are likely to seek a close cooperation with terrorist groups operating in Afghanistan and provide them with financial and logistic support. The ground is being prepared for a re-launching an attack on Afghan targets. The enemy will claim that they are attacking IS/Al-Qaeda etc. but the real target will be the Afghan economy.

Meanwhile a well-thought out plan of economic sabotage has also been developed with the establishment of a monetary fund in Geneva. This seeks to flood the Afghan economy with imperialist issued local currency and to establish a monopoly over Afghan energy (specially electricity) imports.

The main targets of the counter-revolutionary imperialist strategy are:

1. The overthrow of the Taliban government
2. To take control of the Afghan economy from the hands of the Islamic government
3. Disturb the law and order situation to such an extent that local reactionary groups like the erstwhile Northern Alliance can be mobilized for seizing Afghan territories

This strategy is very similar to that adopted by the imperialist powers during 1918-22 civil war in the former

USSR (except that air power was not used there).

Our Strategy

Foundations

a. We must understand that the Afghan Jihad has entered a new phase – it is not over and fighting the war against the imperialist attack is the principle task of the survival of the Taliban regime at this stage of the revolution.

b. We must recognize that making consessions to the enemy in the area of social, political or economic policy will only encourage the enemy to demand the dilution of the Islamic character of our regime and to surrender the Afghan national economy and polity to capitalist imperialist order

c. We must have complete confidence in our ability with the help of Allah to defeat the enemy in this war. We are not interested in the possibility of defeat. They do not exist.

Economic Strategy

a. It is essential to create a war economy by prioritizing investment in the IT and surveillance equipment sector and linking the armament economy to the agricultural and manufacturing sector.

b. Developing a mass based surveillance and civil defense force of about a million people spread throughout the country and present in all major economic and administrative establishments. This requires a massive, rapid expansion of the Taliban movement and a consolidation of local power in its hand

c. Resource constraints for such mobilization can be reduced by the issuance of a baseless currency – the Islamic Dinar. The volume and circulation of which should be based on

d. the physical – not financial – requirements of the national population and exchange system.

e. Severance of arrangements for the printing of national currency in Germany and making sure that currency printed

by the Geneva based Fund does not enter or circulate in Afghanistan

f. Immediate nationalization of banks and financial institutions and severance of their links with imperialist money and capital markets.

g. Establishment of state monopoly over all foreign exchange transactions and foreign exchange inflows and outflows.

(Details of these proposals are provided in the WGAE document "Developing a Planning System for the Imarat-e-Islamia)

The Political Strategy

a. Expulsion of all UN agencies, imperialist financed NGOs and press correspondents from Afghanistan – as these are the main sources for the flow of espionage related information to the imperialists.

b. Control of all IT related activities and platforms in Afghanistan

c. Development of a mass based surveillance system consisting of at least a million people with devolved administrative and financial powers focused on surveillance, dawah and welfare activities.

d. Serious attempts to develop military and surveillance cooperation with both Iran and Russia. Both Iran and Russia are seriously challenged by American aggression. Iran has developed a very effective surveillance system to safeguard its nuclear capability. Russia is threatened by NATO expansion. Defending the independence of the Afghan regime is in the national interest of both Iran and Russia both of which would be threatened by the establishment of a client pro imperialist regime in Kabul. The aim of military cooperation should be to induce Iran and Russia to strengthen the Afghan defense systems and to ensure air security over Afghan territory.

[Working Group on Afghan Economy]

CPL No. 296 Monthly Al Burhan November 2022

مقالاتِ تعلیم

پروفیسر محمد حسین ملک

مرتب

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

مکتبہ البرہان
لاہور